بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
صوفی عبدالحمید
خان سواتیؒ

بیاد
شیخ الحدیث حضرت مولانا
محمد سرفراز خان
صفدرؒ

ماہنامہ
الشریعہ
گوجرانوالہ، پاکستان

مؤسس و مدیر
حضرت مولانا ابوعمار
زاہد الراشدی

مدیر منتظم
ناصر الدین خان عامر

جلد ۳۶۔ شمارہ ۷۔ جولائی ۲۰۲۵ء

مجلسِ مشاورت

قاضی محمد رویس خان ایوبی۔ ڈاکٹر محمد طفیل ہاشمی۔ پروفیسر غلام رسول عدیم۔
ڈاکٹر سید متین احمد شاہ۔ ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر۔

مجلسِ تحریر

ڈاکٹر محمد زاہد صدیق مغل ۔ مولانا سمیع اللہ سعدی۔ ڈاکٹر حافظ محمد رشید۔ مولانا عبدالغنی محمدی۔
مولانا فضل الہادی۔ مولانا حافظ خرم شہزاد۔ مولانا محمد اسامہ قاسم۔ ہلال خان ناصر۔

معاونین

مولانا حافظ کامران حیدر۔ مولانا حافظ شیراز نوید۔ مولانا حافظ دانیال عمر۔ حافظ شاہد الرحمٰن میر۔

الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، کنگنی والا، گوجرانوالہ، پاکستان

www.alsharia.org — editor@alsharia.org

ناشر: حافظ محمد عبدالمتین خان زاہد۔ طابع: مسعود اختر پرنٹرز، میکلوڈ روڈ، لاہور۔

فہرست

اسلامی نظام اور آج کے دور میں اس کی عملداری 5

مولانا ابوعمار زاہد الراشدی

اردو تراجم قرآن پر ایک نظر: مولانا امانت اللہ اصلاحیؒ کے افادات کی روشنی میں (۱۲۶) 8

ڈاکٹر محی الدین غازی

"خطباتِ فتحیہ: احکام القرآن اور عصرِ حاضر" (۱) 13

مولانا ڈاکٹر محمد سعید عاطف / حافظ میاں محمد نعمان

اہلِ کتاب کی بخشش کا مسئلہ 21

ڈاکٹر محمد عمار خان ناصر

سوشل میڈیائی "آدابِ" اختلاف اور روایتی مراسلت 23

ڈاکٹر شہزاد اقبال شام / ڈاکٹر قاری عبد الباسط / مولانا عبد الجبار سلفی

حدیث میں بیان کی گئی علاماتِ قیامت کی تاریخی واقعات سے ہم آہنگی، بائیبل اور قرآن کی روشنی میں (۲) 29

ڈاکٹر محمد سعد سلیم

"اسلام اور ارتقا: الغزالی اور جدید ارتقائی نظریات کا جائزہ" (۵) 51

ڈاکٹر شعیب احمد ملک / مترجم: ڈاکٹر ثمینہ کوثر

شاہ ولی اللہؒ اور ان کے صاحبزادگان (۲) 73

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

حضرت علامہ ظہیر احسن شوق نیموی (۴) 93

مولانا طلحہ نعمت ندوی

مسئلہ ختم نبوت اور مرزائیت............100
شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ / انتخاب: مولانا حافظ خرم شہزاد

بیوہ خواتین اور معاشرتی ذمہ داریاں............103
مولانا محمد طارق نعمان گڑنگی

پاکستان شریعت کونسل اور الشریعہ اکادمی کے اجتماعات............107
مولانا حافظ امجد محمود معاویہ / مولانا محمد اسامہ قاسم

110. .Britain's Long-Standing Role in Palestine's Transformation into Israel
Abu-Ammar Zahid-ur-Rashdi

(یوٹیوب چینل Usmania Media Official پر نشر ہونے والی ایک نشست کی گفتگو)

بعد الحمد والصلوٰۃ۔ آج کی ہماری گفتگو کا عنوان ہے ’’اسلامی نظام کی اہمیت اور ضرورت‘‘۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اسلامی نظام کیا ہے؟ اللہ رب العزت نے جب نسلِ انسانی کو اس زمین پر آباد کرنے کا آغاز کیا اور حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام کو زمین پر اتارا تو اس وقت ایک بات فرمائی تھی کہ ’’اهبطوا منها جميعا فاما ياتينكم مني هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولا هم يحزنون‘‘ (البقرۃ ۳۸) کچھ عرصہ تم نے اور تمہاری اولاد نے اس زمین پر رہنا ہے، ہدایات میری طرف سے آئیں گی، جس نے ان ہدایات کی پیروی کی وہ خوف اور غم سے نجات پائیں گے اور کامیاب ہو کر واپس آئیں گے۔ تو اسلامی نظام وہی ہے جو اللہ رب العزت نے پہلے دن آدم اور حوا علیہما السلام سے کہا تھا کہ ’’اما ياتينكم مني هدى‘‘ ہدایت میری طرف سے آئے گی، اس کی پیروی لازمی ہے۔

اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا کیا، زمین پر بسایا اور اللہ ہی وسائل مہیا کر رہا ہے۔ جیسا کہ پہلے دن اللہ تعالیٰ نے یہ بات بھی فرما دی تھی کہ ’’ولكم فى الارض مستقر ومتاع الى حين‘‘ قیامت تک کا وقت متعیّن ہے جب تک زمین میں رہنے کی جگہ بھی ہو گی اور اسباب بھی ہوں گے۔ یعنی آج کی اصطلاح میں روٹی، کپڑا اور مکان ملیں گے۔ تو جب اللہ کی زمین پر اللہ کی دی ہوئی زندگی اور اسباب کے ساتھ رہنا ہے تو ہدایات بھی اللہ کی طرف سے ہوں گی۔ ہدایات کا یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر آکر مکمل ہوا۔ درمیان میں ہزاروں رسول اور پیغمبر علیہم الصلوات والتسلیمات آئے۔ اور جو ہدایات قرآن کریم اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کی صورت میں مکمل ہوئیں، اسی کا نام اسلامی نظام ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عملاً قائم کر کے دکھایا۔

حضورؐ جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں کے لوگوں سے مل کر باقاعدہ ایک ریاست قائم کی، اس میں مسلمان بھی تھے، یہودی بھی تھے، اور لوگ بھی تھے۔ میثاقِ مدینہ ہوا تھا۔ آپؐ نے یثرب کو مدینہ میں تبدیل کر کے اسلامی ریاست قائم کی جو اس وقت تو ایک سمندری پٹی میں تھی، جسے بحیرہ کہتے ہیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال تک دس سال کے عرصہ میں یہ ریاست پورے جزیرۃ العرب کو گھیرے میں لے چکی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب بطور خلیفۃ الرسول منتخب ہوئے تو پورے جزیرۃ العرب کا انہوں نے انتظام سنبھالا تھا۔ پھر خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور ان کے بعد خلفاء نے اسے باقاعدہ نظام کی شکل دی جو صدیوں تک دنیا پر حکمرانی کرتا رہا۔ چنانچہ وہ نظام جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن و سنت کی شکل میں دیا، جو خلافتِ راشدہؓ کے دور میں اور بعد کے ادوار میں عملاً نافذ رہا، وہ اسلامی نظام ہے۔

آج بھی دنیا کو اس نظام کی ضرورت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ کسی بھی مشین کو اس کے بنانے والے کی ہدایات کے مطابق چلایا جائے تو وہ صحیح کام کرتی ہے، اگر چلانے والا اپنی مرضی کرے گا تو گڑبڑ کرے گا۔ سادہ سی بات ہے کہ آج بھی کوئی بڑی صنعت نئی مشین ایجاد کرتی ہے تو مشین کے ساتھ اس کا تعارف بھی ہوتا ہے اور استعمال کا طریقہ کار بھی ہوتا ہے۔ انسان بھی ایک مشین ہے اور انسانوں سے مرتب ہونے والا سماج بھی۔ انسانی چمڑے کے اندر کائنات کی پیچیدہ ترین مشینری ہے۔ انسان اور انسانی سماج تب صحیح نتائج دے گا جب اسے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق اور خلفاء راشدین کی راہنمائی میں چلایا جائے گا۔

مگر گزشتہ دو تین سو برس سے دنیا ایک خودساختہ فلسفہ کے تحت زندگی بسر کر رہی ہے، جو انقلابِ فرانس سے شروع ہوا تھا، کہ سوسائٹی اپنا نفع ونقصان سمجھتی ہے، وہ اپنے فیصلے خود کرے گی، اپنا قانون خود بنائے گی، اور اسے باہر سے کسی ڈکٹیشن یا ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اب وقت آگیا ہے کہ واپس اس طرف جایا جائے کہ انسانی سماج کو انسانی تصورات و خواہشات کے دائرے سے نکال کر بنانے والے خدا اور اس کے رسول کی ہدایات کے مطابق منظم کیا جائے۔

افغانستان میں جو تبدیلیاں آئی ہیں کہ افغان قوم نے اپنے فیصلے خود کرنے کا اختیار حاصل کیا ہے، میں اسے اس پہلو سے دیکھتا ہوں کہ یہ آسمانی تعلیمات ''اما یاتینکم منی هدی'' کی طرف واپس جانے کا ٹرننگ پوائنٹ ہے۔ ورنہ گزشتہ دو ڈھائی سو سال ہم نے جس غلامی میں گزارے ہیں، پہلے وہ صریح غلامی تھی اور اب ریموٹ کنٹرول غلامی ہے۔ مسلم ممالک کو آپ دیکھ لیں کہ ان کی غلامی پر آزادی کا ایک پردہ چڑھا ہوا ہے۔ مسلمان حکمران بظاہر آزاد اور خودمختار کہلاتے ہیں لیکن ہمارے فیصلے ہمارے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ ہماری دستور و قانون سازی اور پالیسی سازی عالم اسلام میں کہیں بھی ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے، ہم پر بین الاقوامی ادارے اور معاہدات مسلط ہیں، اور ہم پر عالمی استعمار مسلط ہے

جو اپنی مرضی کے فیصلے کروا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ موقع بڑی طویل جدوجہد اور بڑی قربانیوں کے بعد دیا ہے اور افغان قوم تو بیچاری ذبح ہو گئی ہے۔ اس مقام تک پہنچنے کے لیے کہ وہ دنیا سے یہ کہہ سکیں کہ ہمارے کاموں میں مداخلت نہ کرو، ہمیں اپنا کام کرنے دو، ہمارا اپنا ایک فلسفہ ہے، ہمارے پاس اپنا ایک نظام ہے، ہماری ایک تہذیب ہے، ہمیں دنیا کو چلا کر دکھانے تو دو۔

میرا ایمان ہے کہ قرآن و سنت کے احکام و تعلیمات کو خلافتِ راشدہ کی روشنی میں دنیا کے کسی خطے کے اندر دس سال آزادی کے ساتھ کسی بیرونی مداخلت کے بغیر عملداری کا موقع مل جائے تو ان شاء اللہ العزیز دنیا دیکھے گی کہ آسمانی تعلیمات کی برکات کیا ہیں اور اسلامی نظام کے ثمرات کیا ہیں۔ جبکہ اسی بات سے دنیا کے بہت سے حلقے ڈر رہے ہیں کہ اگر آسمانی تعلیمات کو اپنی عملداری کے لیے کسی خطہ میں دس پندرہ سال آزادانہ موقع مل گیا تو اس کے نتائج پوری دنیا کے لیے نمونہ ہوں گے۔ میں اس لحاظ سے افغانستان کی صورتحال پر خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ ہمیں ایک موقع مل رہا ہے کہ ہمارا ایک طبقہ اور خطہ یہ کہنے کی پوزیشن میں ہے کہ ہم اپنے فیصلے خود کریں گے، آپ صرف دیکھتے رہیں کہ ہم کیا کرتے ہیں، اگر نتائج اچھے ہوئے تو آپ بھی قبول کر لینا۔

بہرحال انسانی سماج پر اللہ اور اس کے رسول کے احکام و قوانین کے نفاذ کا نام اسلامی نظام ہے۔ اور یہ نفاذ پورے خلوص اور آزادی کے ساتھ ہو جیسے خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کیا تھا، اور اس کے بعد بھی اس کا تسلسل رہا ہے، آج اس تسلسل کو دوبارہ تاریخ کے ساتھ جوڑنے کی ضرورت ہے۔ اللہ رب العزت ہمیں یہ قوت اور اسباب دیں کہ ہم خلافتِ اسلامیہ اور اسلامی نظام کی صورت میں خدا کی زمین پر خدا کے نظام کا منظر ایک دفعہ پھر پیش کر سکیں اور اس کے ثمرات اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں (آمین)۔

(598) غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں غیر کا تعلق صراط (راستے) سے ہے یا الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ (وہ لوگ جن پر اللہ کا انعام ہوا) سے؟ اس سلسلے میں ہمیں عربی تفاسیر میں دونوں موقف ملتے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ صراط حالت نصب میں ہے، الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ حالت جر میں ہے اور غیر بھی حالت جر میں ہے۔ اس لیے اقرب توجیہ یہ ہے کہ غیر کو صراط کی صفت کے بجائے الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی صفت بنانا چاہیے۔ جن لوگوں نے غیر کو صراط کی صفت بنایا ہے انھیں اس کی پر تکلف توجیہ کرنی پڑتی ہے۔ اس کے باوجود اردو تراجم میں زیادہ لوگوں نے غیر کو صراط کی صفت مان کر ترجمہ کیا ہے۔ درج ذیل ترجمے ملاحظہ ہوں:

صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ۔ (الفاتحہ: 7)

”راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا، نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا“۔ (احمد رضا خان)

”ان لوگوں کے رستے جن پر تو اپنا فضل وکرم کرتا رہا نہ ان کے جن پر غصے ہوتا رہا اور نہ گمراہوں کے“۔ (فتح محمد جالندھری)

”ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام کیا ان کی نہیں جن پر غضب کیا گیا اور نہ گمراہوں کی“۔ (محمد جوناگڑھی، وضاحتی قوسین حذف کرکے)

”ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا ہے، نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ کا غضب کیا گیا اور نہ ان لوگوں کا جو راستہ سے گم ہوئے“۔ (اشرف علی تھانوی)

”ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، ان کا نہیں جو تیرے غضب کا نشانہ بنے نہ ہی ان کا جو راہ راست سے بھٹک گئے“۔ (صدرالدین اصلاحی)

درج بالا ترجموں میں غیر کو صراط کی صفت مان کر ترجمہ کیا گیا ہے۔ البتہ درج ذیل ترجمے غیر کو الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ کی صفت بنا کر ترجمہ کرتے ہیں:

”ان لوگوں کی جن پر تو نے فضل کیا نہ جن پر غصہ ہوا اور نہ بہکنے والے“۔ (شاہ عبدالقادر)

”اُن لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا، جو معتوب نہیں ہوئے، جو بھٹکے ہوئے نہیں ہیں“۔ (سید مودودی)

(599) وَمِمَّا رَزَقْنَاہُمْ یُنْفِقُونَ کا ترجمہ

وَمِمَّا رَزَقْنَاہُمْ یُنْفِقُونَ۔ (البقرۃ: 3)

”اور اس رزق میں سے جو ہم نے انہیں بخشا ہے، ایک حصہ (ہماری راہ میں) خرچ کرتے ہیں“۔ (صدرالدین اصلاحی)

اس ترجمے میں ”ایک حصہ“ مناسب تعبیر نہیں ہے۔

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

”اور ہمارے دیے ہوئے (مال) میں سے خرچ کرتے ہیں“۔ (محمد جوناگڑھی)

(600) وَبِالْآخِرَةِ ہُمْ یُوقِنُونَ کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں ”ھم“ کی معنویت کو کیسے ظاہر کیا جائے؟

درج ذیل ترجموں میں ”بھی“ کا اضافہ کیا گیا ہے۔

وَبِالْآخِرَةِ ہُمْ یُوقِنُونَ۔ (البقرۃ: 4)

”اور (پھر یہ کہ) آخرت پر بھی گہرا یقین رکھتے ہیں“۔ (صدرالدین اصلاحی)

”اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں“۔ (محمد جوناگڑھی)

”اور آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں“۔ (ذیشان جوادی)

مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی کا درج ذیل ترجمہ تجویز کرتے ہیں:

”اور آخرت پر وہی گہرا یقین رکھتے ہیں“۔

گویا ھم کی وجہ سے ’وہی‘ کا معنی پیدا ہو گیا۔

(601) اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں اشْتَرَوُا کا لفظ آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں معروف معنی میں دو چیزوں کا تبادلہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ یہ مراد ہے کہ ایک چیز سے دست بردار ہو کر دوسری چیز اختیار کرلی۔

أُولَئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَى۔ (البقرة:16)

”یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت دے کر گمراہی خریدی ہے“۔ (صدرالدین اصلاحی)

”یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کو دے کر گمراہی خرید لی ہے“۔ (ذیشان جوادی)

درج بالا دونوں ترجمے درست نہیں ہیں کیوں کہ ہدایت کسی کو دے کر اس سے گم راہی نہیں لی گئی۔

”یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے“۔ (سید مودودی)

”یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں خرید لیا“۔ (محمد جوناگڑھی)

درج بالا دونوں ترجمے درست ہوسکتے ہیں اس معنی میں نہیں کہ دونوں چیزوں کا تبادلہ ہوا بلکہ اس معنی میں کہ انھیں ہدایت لینی چاہیے تھی لیکن انھوں نے ہدایت نہ لے کر گم راہی لے لی۔

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

”یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت چھوڑ کر گمراہی خریدی“۔ (فتح محمد جالندھری)

(602) ہُدًی کا ترجمہ

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى۔ (البقرة:38)

”پھر وہاں جو میری طرف سے کوئی ہدایت نامہ تمھارے پاس پہنچے“۔ (صدرالدین اصلاحی)

اس ترجمے میں ھدی کا ترجمہ ہدایت نامہ کیا گیا ہے۔ لیکن ھدی عام ہے، اس میں ہر طرح کی ہدایت شامل ہے۔ اس بات کا امکان ہے کہ قدیم ترین زمانے میں رسولوں کے ساتھ زبانی ہدایت آتی رہی ہو کتاب کی صورت میں نہیں ہو۔ ہدایت نامہ کہنے سے بات محدود ہوجاتی ہے۔

”پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے“۔ (سید مودودی، ”کوئی“ کی ضرورت نہیں ہے۔)

”جب کبھی تمھارے پاس میری ہدایت پہنچے“۔ (محمد جوناگڑھی، ”میری ہدایت“ نہیں بلکہ ”میری طرف سے ہدایت“ ہونا چاہیے۔)

”جب تمھارے پاس میری طرف سے ہدایت پہنچے“۔ (فتح محمد جالندھری)

(603) وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ کا ترجمہ

درج ذیل جملے میں الحرث یعنی کھیتی کا ذکر ہے۔ بعض ترجموں میں یہ نظر انداز ہوگیا ہے۔

وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ۔(البقرۃ: 71)

”نہ پانی کھینچتی ہے“۔(سید مودودی)

”نہ پانی کھینچتی ہو“۔(صدرالدین اصلاحی)

درج ذیل ترجموں میں الحرث کا ترجمہ کیا گیا ہے:

”اور نہ کھیتی کو پانی دیتا ہو“۔(فتح محمد جالندھری)

”اور کھیتوں کو پانی پلانے والی نہیں“۔(محمد جوناگڑھی)

(604) وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ کا ترجمہ

درج ذیل جملے میں وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ اقرار کے وقت کا بیان نہیں ہے بلکہ موجودہ حال کا بیان ہے۔یعنی یہ نہیں کہا جارہا ہے کہ اقرار کرتے وقت تم گواہ بنے تھے۔بلکہ یہ کہا جارہا ہے کہ آج تم خود اس کے شاہد و گواہ ہو کہ تم نے یہ اقرار کیا تھا۔

ثُمَّ أَقْرَرْتُمْ وَأَنْتُمْ تَشْهَدُونَ۔(البقرۃ: 84)

”اور تم نے خود شاہد بنتے ہوئے اس کا اقرار بھی کر لیا تھا“۔(صدرالدین اصلاحی)

”تم نے اقرار کیا اور تم اس کے شاہد بنے“۔(محمد جوناگڑھی)

درج ذیل ترجمہ مناسب ہے:

”تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو“۔(سید مودودی)

(605) فَلْيَسْتَجِيبُوا لِی کا ترجمہ

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِی۔(البقرۃ: 186)

”میں اُس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں لہٰذا انہیں چاہیے کہ میری دعوت پر لبیک کہیں“۔(سید مودودی)

فَلْيَسْتَجِيبُوا لِی کے درج ذیل ترجمے توجہ طلب ہیں:

”پس انھیں چاہیے کہ میری پکار کا بھی جواب دیں“۔(صدرالدین اصلاحی)

یہاں جملے میں ”بھی“ کا محل درست نہیں ہے۔درست محل کے لحاظ سے جملہ حسب ذیل ہونا چاہیے:

”پس انھیں چاہیے بھی کہ میری پکار کا جواب دیں“۔(صدرالدین اصلاحی)

”لہٰذا مجھ سے طلب قبولیت کریں“۔(ذیشان جوادی)

اگرچہ استجاب باب استفعال سے ہے، لیکن استجاب میں طلب نہیں بلکہ مبالغہ ہے۔ استجاب أجاب کے معنی میں ہے۔ اس لیے درج بالا ترجمہ موزوں نہیں ہے۔

(606) الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ کا ترجمہ

درج ذیل قرآنی عبارت کے ترجمے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے مفہوم واضح ہو کر سامنے نہیں آتا ہے۔

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَاتُ قِصَاصٌ۔ (البقرة: 194)

"(ایک) حرمت والا مہینہ (دوسرے) حرمت والے مہینے کے برابر ہے۔ (اور اصل یہ ہے کہ) حرمتوں میں برابری کا بدلہ ہے"۔ (صدرالدین اصلاحی)

"ماہ حرام کا بدلہ ماہ حرام ہی ہے اور تمام حرمتوں کا لحاظ برابری کے ساتھ ہوگا"۔ (سید مودودی)

"ماہ حرام کے بدلے ماہ حرام اور ادب کے بدلے ادب ہے"۔ (احمد رضا خان)

"ادب کا مہینہ ادب کے مہینے کے مقابل ہے اور ادب کی چیزیں ایک دوسرے کا بدلہ ہیں"۔ (فتح محمد جالندھری)

"شہر حرام کا جواب شہر حرام ہے اور حرمات کا بھی قصاص ہے"۔ (ذیشان جوادی)

"حرمت والے مہینے حرمت والے مہینوں کے بدلے ہیں اور حرمتیں ادلے بدلے کی ہیں"۔ (محمد جونا گڑھی)

مولانا محمد امانت اللہ اصلاحی حسب ذیل ترجمہ تجویز کرتے ہیں:

"حرمت والے مہینے کی حیثیت حرمت والے مہینے ہی کی ہے اور حرمتوں میں برابری کا معاملہ ہے"۔

(607) النَّسْلَ کا ترجمہ

درج ذیل آیت میں الحرث کے ساتھ النسل آیا ہے۔ اس لیے اس کا امکان تو ہے کہ یہاں نسل سے مویشیوں کی نسل مراد ہو لیکن سیاق کے لحاظ سے انسانی نسل مراد ہو یہ بعید لگتا ہے۔ اگر لفظ کا خیال کیا جائے تو انسان اور مویشی وغیرہ سبھی جان دار مراد لیں، ورنہ پھر سیاق کے لحاظ سے مویشی مراد لیں۔ ترجمے ملاحظہ ہوں:

وَإِذَا تَوَلَّىٰ سَعَىٰ فِي الْأَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ۔ (البقرة: 205)

"جب اُسے اقتدار حاصل ہو جاتا ہے، تو زمین میں اُس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائے، کھیتوں کو غارت کرے اور نسل انسانی کو تباہ کرے"۔ (سید مودودی)

"کھیتوں اور انسانی نسلوں کو تباہ کرنے میں سرگرم عمل رہتا ہے"۔ (صدرالدین اصلاحی)

"اور کھیتی اور جانیں تباہ کرے"۔ (احمد رضا خان)

"اور کھیتی اور مویشی کو برباد کرنے کی کوشش کرتا ہے"۔ (احمد علی)

"اور کھیتی اور نسل کی بربادی کی کوشش میں لگا رہتا ہے"۔ (محمد جونا گڑھی)

خطیب جامعہ فتحیہ لاہور مولانا ڈاکٹر محمد سعید عاطف صاحب کے مندرجہ پیغام اور شکریہ کے ساتھ اس نئے سلسلہ کا آغاز کیا جا رہا ہے: "جامعہ فتحیہ میں حضرت مولانا زاہد الراشدی نے احکام القرآن کے تناظر میں وقیع علمی خطبات ارشاد فرمائے۔ یہ "خطباتِ فتحیہ" کے عنوان سے تخریج و تعلیق اور تحقیق کے ساتھ اعلیٰ معیار پر دارالمؤلفین کی طرف سے شائع ہو گئے ہیں۔ آپ کی علم پروری سے امید ہے کہ مجلّہ الشریعہ کے ہر شمارے میں اس علمی ارمغان کے ایک خطبے کو نذرِ قارئین فرمائیں گے۔ خیراندیش"

عرضِ مرتب

از مولانا ڈاکٹر محمد سعید عاطف

اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب خاتم النبیین ﷺ پر نازل ہوئی۔ جس کا مفہوم یہ ٹھہرا کہ ختمِ نبوت کے طفیل اب صبحِ قیامت تک انسانیت کو درپیش مسائل کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں ہی پیش کیا جائے گا۔ ہماری چودہ صدیوں سے زائد کی شاندار علمی تراث اس کی آئینہ دار ہے کہ اپنے وقت کے شہ دماغوں نے کتاب و سنت پر غور و فکر کر کے تہذیبِ انسانی کو شاندار اُصول دیے۔ ان ائمہ محدثین و فقہاء کے اُصولِ استنباط اور فکر و نظر کے عمق اور وسعت سے قانونی اور تہذیبی دُنیا قیامت تک مستفید ہوتی رہے گی۔

احکام القرآن اپنی بنیادی حیثیت سے نزول کے وقت سے وہی ہیں لیکن عصری تغیرات و تمدنی ارتقا کے سبب ان کی تفسیر اور توضیح میں برابر وسعت آتی رہی ہے۔ قرآن مجید کے حِکم و بصائر سے استنباط کی بدولت اس کے متعدّد معاون علوم وجود میں آئے، جن سے فہمِ قرآنی میں وسعت پذیری کا عمل جاری رہا۔ دورِ خلفائے راشدینؓ میں ان احکامات کو قرآن و

سنت کی بنیادوں پر ہمہ پہلو وسعت ملی۔ یہ وسعت اصلاً مقاصدِ نبوت کی تکمیل ہی کی ایک صورت تھی۔ بالخصوص اس معاملہ میں فراستِ فاروقیؓ نے صحابہ کرامؓ کے اجتماعی فہم سے فائدہ اُٹھاکر قوانین کی تشکیل اور توسیع کا عمل تیز تر فرما دیا۔

تمام قوانینِ اسلامیہ پر برتری و حکمرانی کتابُ اللہ کی تھی اس لیے احکام القرآن بھی تمدنی و سماجی ضرورتوں سے لے کر قانونی و سیاسی ضرورتوں تک کی بخوبی تکمیل کرتے رہے اور ان احکام کی توضیح میں نو بہ نو توسیع بھی ہوتی رہی۔ اور یہ احکام القرآن کی وسعت پذیری تھی جس کے سبب علماء و مفکرین اپنے اپنے عہد میں اٹھائے گئے علمی، تہذیبی، قانونی سوالات کے جوابات دیتے رہے۔ علم و فقاہتِ قرآنی کا یہ قافلہ فقہاء و محدثین اور مفکرین کی سیادت میں صدیوں تک اپنی عقل و دانش سے دینی علوم کی آبیاری کرتا رہا۔ احکام القرآن میں بالخصوص قرآن مجید کے قانونی پہلوؤں سے بیسیوں نئی جہات دریافت ہوئیں۔ اُصولِ فقہ (Islamic Principle of Jurisprudence) کا شاندار علم بھی اصلاً احکام القرآن ہی کی تمدنی و قانونی وسعت کا مظہر ہے۔

برصغیر پاک و ہند میں امام شاہ ولی اللہ دہلوی (وفات: 1762ء) نے اپنے علوم کی بنیاد احکام القرآن کو ہی بنایا۔ آپ کی گراں قدر خدمات و علمی فتوحات کا ہدف بھی احکام القرآن کی توسیع اور اس کا اطلاق رہا ہے۔ ”فتح الرحمٰن“ اور ”الفوز الکبیر“ سے لے کر ”حجۃ اللہ البالغہ“ اور آپ کی دیگر تصانیف کا اگر استحصاء کیا جائے تو ان کا حاصل بھی قرآنی حکمت و بصیرت کا شیوع اور اس پر وارد اشکالات کا ازالہ ہے؛ اور قرآن کے سیاسی، معاشی و جملہ احکام اور نظام کا غلبہ ہی ان کی فکر کا حاصل و خلاصہ ہے۔

اہلِ علم میں صدیوں سے یہ روایت رہی ہے کہ وہ دیگر اہلِ علم سے اخذ و استفادہ کرتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کے متعلق علمی رائے بھی دیتے چلے آئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک کی باہمی معاصرت نے ان کے باہمی اعترافِ علم اور حسنِ تعلق میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اسلاف کے ہاں یہ روایت علمی تصانیف و تالیفات میں بکثرت نظر آئے گی۔ بالخصوص ہمارے فقہاء نے جس طرح دلیل و برہان کی بنیاد پر دیگر ائمہ و اعیانِ دین سے علمی اختلاف کیا، تو وہیں دوسرے فقہاء کی مضبوط و مُحکم دلیل کے سامنے اپنے مؤقف سے رجوع بھی کیا؛ اور علمی رجوع کے اس عمل نے باہمی محبت و احترام میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔

عصری تغیرات اور تمدنی ارتقا کی بدولت گذشتہ صدی میں یہ رجحان ”خطبات“ کی صورت میں بدل گیا۔ اب اہلِ علم دیگر علاقوں و ممالک کے اہلِ دانش و اصحابِ تفقہ سے خطبات اور مکالمے کی صورت میں استفادہ کرتے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے خطباتِ مدراس، جو 1925ء میں دیے گئے، یہ فہمِ اسلام و تفہیمِ سیرت کے لیے بہت مفید ہیں، اور شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال کے خطباتِ اقبال The Reconstruction of Religious Thought in Islam (”تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اِسلامیہ“) کے عنوان سے 1928ء کے اواخر اور 1929ء کی ابتدا میں دیے گئے جو 1930ء میں شائع ہوئے۔

ماضی قریب میں اس کی ایک نمایاں مثال ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ''خطباتِ بہاولپور'' ہیں (جو 1980ء میں دیے گئے)۔ آپ کے یہ گراں قدر خطبات اہلِ پاکستان کے لیے ارمغانِ علمی کی حیثیت رکھتے ہیں، اس کے بعد ڈاکٹر محمود احمد غازی کے سلسلہ محاضرات کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ پھر اس سلسلہ خطبات کی روایت میں مختلف شخصیات نے اپنی علمی استعداد کے مطابق اضافہ کیا اور یہ مبارک علمی سفر ہنوز جاری ہے۔

سربرآوردہ اور اعلیٰ فکری صلاحیتوں کے حامل اجل علماء نے احکام القرآن کو اپنی تگ و تاز کا مرکز بنایا۔ ہمارے عہد میں یہ امتیاز ایک نمایاں علمی شخصیت مولانا زاہد الراشدی صاحب کو حاصل ہے۔ علومِ ولی اللّٰہی سے ان کی نسبت شعوری و خاندانی ہے اور ان علوم سے اشتغال و استدلال ان کا خاص ذوق ہے۔ اپنے عمِ محترم مولانا عبد الحمید سواتی سے ولی اللّٰہی افکار کی تفہیم اور ذوق آپ کو منتقل ہوا۔ بالخصوص مولانا سواتی کی ولی اللّٰہی انداز کی تفسیرِ قرآن نے، جو اصلاً احکام القرآن ہی کی ایک صورت ہے، ان سے اس شعبہ میں استنباط و استشہاد مولانا زاہد الراشدی صاحب کے حصہ میں آیا؛ اور اپنے والد گرامی مولانا محمد سرفراز خان صفدر کے تبحرِ علمی اور توازنِ تحقیق نے بھی آپ کے علمی مزاج کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ نصف صدی سے سیاسی تحریکوں میں آپ کی عملی شرکت کے سبب سیاسی فراست اور عصریات کی نباضی کا ملکہ بھی آپ کے افکار میں نمایاں نظر آتا ہے۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب کو ایک طرف دینی علوم میں رسوخ فی العلم حاصل ہے تو دوسری جانب عصری و عالمی حالات کی نزاکتوں کا بھرپور ادراک ہے۔ ان پہلوؤں کے سبب آپ میں جامعیت کا ایک مزاج تشکیل پا گیا ہے۔ اعتدال و توازن کے ساتھ ساتھ فراست و حکمت بھی قسامِ ازل نے آپ کو ودیعت فرمائی ہے۔ بصیرت اور حکمت کو علمی جرأت و شائستگی سے پیش کرنا آپ کا اختصاصی پہلو ہے جو انھیں عصرِ رواں میں منفرد و ممتاز بناتا ہے۔

آپ احکام القرآن کو آج کے عالمی (Global) تناظر میں غلبۂ دین اور اجتماعیت کے اُسلوب میں پیش کرتے ہیں۔ احکام القرآن کے ذریعے اسلام کا عقلی اور تہذیبی غلبہ آپ کا مقصد ہے۔ مغربی فکر کی تفہیم اور اس کے مطالعہ و مشاہدہ کی بدولت آپ اہلِ مغرب کے علمی، فکری اور سیاسی مزاج سے آشنا ہیں۔ آپ جب احکام القرآن کی عصری توضیح کرتے ہیں تو ہمیں اس میں دینی روایت سے گہرا تعلق اور عصری معنویت کی وسعت برابر دکھائی دیتی ہیں۔ آپ اسلام و اہلِ اسلام کا مقدمہ اہلِ مغرب کے سامنے بڑی متانت، سنجیدگیٔ فکر اور اخلاص کے ساتھ رکھتے ہیں۔ اہلِ مغرب کی کوئی خوبی نظر آئے تو اس کا برملا اعتراف و اظہار کرتے ہیں۔ فکرِ مغرب کی حاملین شخصیات کا احترام کے ساتھ حوالہ دیتے ہیں۔ کمال حکمت سے ان مغربی شخصیات کے طرزِ فکر پر کہیں نقد کرتے اور کہیں ان کے اعترافات سے نتائج اخذ کر کے عصری تناظر میں قرآنی احکام کی برتری ثابت کرتے ہیں۔

آج کی بین الاقوامی دنیا میں جس طرح ''عالمی معاہدات کی حکومت'' ہے، ان معاہدات کی حساسیت اور احکام القرآن کے ساتھ ان کا جہاں جہاں ٹکراؤ ہے، آپ اس کی نشاندہی کرتے ہیں۔ آپ نے دینی و علمی حلقوں کو ان بین الاقوامی

معاہدات کے خطرناک مضمرات سے آگاہ و خبردار کیا ہے۔ آپ کے بیانات میں دانش و حکمت کے ساتھ ساتھ ایک تدریجی ترتیب ہوتی ہے۔ ہر بات کو مرحلہ بہ مرحلہ تسہیل کے ساتھ اپنے مخصوص لفظ ''دائروں'' میں بیان کرتے ہیں۔ دینی روایت کے ساتھ گہرا علمی و عملی تعلق اور جدید مغربی فکر سے جس درجہ آپ کی آشنائی ہے اس درجے کی اونچی شخصیات اب کم نظر آتی ہیں۔ زندگی میں سادگی اور فکر میں گہرائی و توازن آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تادیر ان کے علمی استنباط سے مستفید فرمائے۔

خطبات کا مختصر جائزہ

احکام القرآن کے عنوان سے موسوم یہ خطبات برصغیر کے قدیم علمی مرکز جامعہ فتحیہ (قائم شدہ: 1875ء) اچھرہ لاہور میں دیے گئے ہیں۔ جامعہ میں دیے گئے یہ خطبات ایک طرف سادہ اندازِ بیان کے حامل ہیں تو دوسری جانب حکمت و دانش کے ساتھ ساتھ عالمانہ تجزیے پر بھی مشتمل ہیں۔ ان خطبات میں عقائدِ اسلامیہ سے لے کر مسلمانوں کے سیاسی افکار اور معاشرت کے متعدّد پہلوؤں پر بحث لائے گئے ہیں۔ عہدِ نبویؐ کے پاکیزہ ماحول کی مثالیں خطبات میں جابجا موجود ہیں۔ مولانا راشدی صاحب کا مطالعۂ مغرب عملی نوعیت کا بھی ہے۔ آپ نے مغرب اور امریکہ کے متعدّد اسفار کیے ہیں، اس لیے آپ مغربی معاشرے کی خوبیوں اور کمزوریوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔ مولانا نے بہت سادہ اسلوب میں حکیمانہ نکات کو پیش کیا ہے۔

مغرب میں خاندان کا ادارہ بکھرتا چلا جا رہا ہے۔ اہلِ مغرب اپنی سیاسی و معاشی پالیسیوں کے ذریعے اپنی تہذیبی اقدار کو پوری دُنیا اور بالخصوص مسلمانوں میں تیزی سے پھیلا رہے ہیں۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی امداد کی آڑ میں ایسے مطالبات بھی ساتھ ہی رکھ دیے جاتے ہیں جو مسلمانوں کی تہذیبی اقدار اور بالخصوص خاندانی نظام کے مخالف ہیں۔ اسی طرح اقوام متحدہ کے چارٹر کی متعدّد دفعات اسلامی عقائد و افکار کے خلاف ہیں۔ آپ نے ضمناً ان کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ ان کا تجزیہ کر کے انھیں مذہبی آزادیوں اور انسانی حقوق کے خلاف ہونا ثابت کیا ہے۔ اور علماء کو توجہ دلائی ہے کہ اس حساس پہلو پر اپنی علمی توجہات مرتکز کریں۔

ان خطبات میں مولانا محترم نے اسلام کے خاندانی نظام پر وارد اعتراضات میں سے منتخب اعتراضات کا جواب بہت علمی وقار اور حکمت کے ساتھ دیا ہے۔ فیملی سسٹم کی اسلام میں اہمیت بتلائی ہے، مسلم معاشرے کے نمایاں خصائص اور محاسن بیان کیے ہیں۔ غلامی سے متعلق مغربی حلقوں کی غلط فہمیوں کا تاریخی حوالوں سے ازالہ کیا ہے۔ اسلام میں خاندان کی مرکزیت کو خاتم النبیین ﷺ کے اُسوہ کی روشنی میں پیش کر کے مغربی حلقوں کے اعتراضات کا جواب دیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ نے مغربی معاشرے اور خاندان کو درپیش مسائل کی نشاندہی کرتے ہوئے ان پر متوازن تبصرہ کیا ہے۔ اس ذیل میں اُنھوں نے اپنے مشاہدۂ مغرب کی مثالیں بیان کی ہیں۔ اسی تناظر میں مسلم معاشرے و تہذیب کے

تحفظ پر بھی حکیمانہ گفتگو فرمائی ہے۔

مولانا کی فکر میں نہ تو مغرب سے مخاصمت نظر آتی ہے اور نہ ہی مغربی اقدار و تصورات سے کسی درجہ کی مرعوبیت دکھائی دیتی ہے۔ آپ مغرب پر نقد کرتے ہوئے بھی ان کے اچھے پہلوؤں، جیسے انسان دوستی اور ڈسپلن وغیرہ کا برملا اعتراف کرتے ہیں۔ آپ ان خطبات میں پورے احترام کے ساتھ مغربی دانشوروں کی فکر کا حوالہ دے کر اس کا عقلی و معاشرتی تجزیہ کرتے ہیں۔ اس نقد و تجزیہ میں ہمیں کہیں بھی مغرب دشمنی نظر نہیں آتی۔ آپ ردعمل کی نفسیات کا شکار نہیں ہوتے بلکہ آپ کا انداز حکیمانہ اور دعوتی ہوتا ہے۔ تفہیمِ مغرب کا یہ اسلوب ہمارے علمی و مذہبی حلقوں میں اب کم کم پایا جاتا ہے۔ آپ مغرب کے ساتھ مناظرے کی بجائے مکالمے اور بریفنگ (Briefing) کے قائل نظر آتے ہیں۔

دینی افکار و شخصیات کے ساتھ ساتھ دینی مدارس بھی اہلِ مغرب کی مخصوص توجہ اور تنقید کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ بالخصوص برصغیر پاک و ہند بشمول بنگلہ دیش کے دینی مدارس، جو دینی علوم و اخلاق کے ساتھ ساتھ دینی تہذیب و اقدار کے عملی نمونے بھی پیش کرتے ہیں۔ مولانا نے عقلی بنیادوں پر ان مدارس کی اخلاقی و تہذیبی افادیت ثابت کی ہے۔ اہلِ مغرب اپنے سیاسی و معاشی تسلط کے زعم میں اپنے تہذیبی غلبے کو بھی لازمی سمجھتے ہیں۔ ان کی راہ میں دیگر رکاوٹوں کے ساتھ ساتھ ایک رکاوٹ راسخ العقیدہ مسلمان اور ان کی تہذیبی اقدار ہیں۔

مولانا محترم نے ان خطبات میں مدارسِ دینیہ کی تاریخ اور ان کی عزیمت و قربانی کے متعدّد پہلو بیان کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مدارس پر وارد اعتراضات کا حکیمانہ اور تجزیاتی انداز میں جواب بھی دیا ہے۔ آپ نے لبرل و آزاد حلقوں کے الزامات کے ساتھ ساتھ مغربی فکر سے مرعوب کچھ اپنوں کی غلط فہمیوں کو بھی دور کیا ہے؛ اور ثابت کیا ہے کہ ایک مسلم معاشرے میں عمدہ اخلاق، حسنِ معاشرت اور اعلیٰ اقدار کے تحفظ اور فروغ کے لیے مدارس کا وجود کس قدر ضروری ہے۔ دینی مدارس کی تعلیم و تزکیے میں خدمات بیان کی ہیں؛ اور ساتھ ہی سیاست میں ان مدارس کے اجتماعی کردار (Role) کے مثبت پہلو اجاگر کیے ہیں۔ اس حسنِ تفہیم کے ساتھ ساتھ آپ نے دینی مدارس کو اس فکری کشمکش میں ان کی ذمہ داریوں کا احساس بھی دلایا ہے۔ اس ضمن میں اُنھوں نے سوسائٹی اور مذہب کے باہمی تعلق کی ضرورت بتاتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ فکری و اخلاقی ارتقا کے لیے اسلام سے پختہ تعلق کی کس قدر ضرورت ہے۔ اس درویش خدا مست کی جہاں بین نگاہ نے اہلِ مدارس کے لیے آئندہ اہداف کی تعیین بھی کر دی ہے۔

جامعہ فتحیہ میں دیے گئے آپ کے یہ خطبات عصری اور دینی دانش کا نمونہ ہیں۔ چونکہ یہ خطبات ہفتہ وار ہوتے تھے اس لیے ان میں ربط اور تسلسل کے لیے بقدرِ ضرورت تکرار رہی، ایسے مقامات کو مختصراً حذف کیا گیا، جہاں تکرار طویل ہو گئی تو وہاں اوّل بحث کا حوالہ دے دیا ہے۔ ان خطبات میں ہر طبقے کے لوگ شریک ہوتے تھے، اس لیے کئی نکات کو سادہ انداز سے بیان کیا گیا ہے۔

ہم نے ان خطبات کی ترتیب و تہذیب میں ایک دو مقامات پر آپ کے فکر انگیز اخباری کالموں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ یہ کالم اپنے اختصار اور موضوع سے مناسبت کی بنا پر شامل کرنے ضروری سمجھے گئے۔ عصری دانش اور عدالت میں فروکش شخصیت جناب جسٹس بدیع الزمان کیکاؤس کی طرف سے اُٹھائے گئے چند اہم سوالات کے جوابات بھی ”انسانی اجتماعیت کے جدید تقاضے اور اسلام کا عادلانہ نظام کے عنوان“ سے شامل کیے ہیں۔ یہ سوالات بظاہر تو سوالات ہیں لیکن یہ اصل میں لبرلز حلقوں کی طرف سے اُٹھائے گئے اعتراضات ہیں۔ مولانا زاہد الراشدی صاحب نے کمال جامعیت و توازن کے ساتھ قرآن و سنت اور فکرِ اسلامی کی روشنی میں شائستہ علمی لہجے میں ان کے جوابات تحریر فرمائے ہیں۔ یہ اشکالات اب بھی پیدا کیے جا رہے ہیں۔ یہ جوابات بھی بنیادی طور احکام القرآن کی جہت سے ہیں۔ اس تناظر میں ان کا شمول بھی اس مجموعہ خطبات میں ضروری سمجھا گیا۔

حضرت استاذ زادہ صاحب کے خطبات میں وارد آیات و احادیث کی تخریج کی گئی ہے۔ کہیں حوالہ دیا گیا ہے اور کسی جگہ ضرورت سمجھتے ہوئے پوری روایت درج کی ہے۔ دورانِ خطبات جن جملوں کی تکرار ہوئی انھیں حذف کر دیا ہے۔ بسا اوقات دورانِ گفتگو جملوں کی ترتیب میں الفاظ کی تقدیم و تاخیر ہو جاتی ہے، ایسے مقامات کو تحریری انداز میں بدلا گیا ہے۔ بسا اوقات دورانِ گفتگو جملوں کی ترتیب کو تحریر میں بدلنے کے لیے متعدّد تبدیلیاں کرنی پڑی ہیں۔ یہ کام بھی بہت احتیاط سے سرانجام دیا گیا ہے۔ پھر بھی کوشش کی ہے کہ گفتگو کی بے ساختگی برقرار رہے۔ آخر میں مصادر کی فہرست بھی لگا دی ہے۔ جناب محمد شاہد حنیف (MLIS) نے محنت کے ساتھ فنی بنیادوں پر جامع اشاریہ مرتب کر دیا ہے، اس سے متعلقہ موضوع، شخصیت و مقام تک رسائی آسان تر ہو گئی ہے۔ اپنی طرف سے کوشش کی ہے کہ ان خطبات کی پیش کاری (Presentation) میں کوئی فنی کمی نہ رہے۔ پھر بھی احتیاطاً یہ خطبات مولانا راشدی صاحب کے سامنے رکھے گئے۔ آپ نے انھیں بالتفصیل دیکھ کر اپنے قلم سے اصلاح و تصویب فرمائی اور مخلصانہ و محبانہ دعاؤں سے بھی نوازا۔

یہ طالب علم حضرت الاستاذ مولانا سرفراز خان صفدر اور علومِ ولی اللّٰہی کے شناور مولانا عبد الحمید سواتی کا ادنیٰ شاگرد ہے۔ اس عالی خانوادے سے علمی و تربیتی نہج کا فیض پایا ہے۔ شعوری و فکری تعلق کے ساتھ ساتھ اس نسبت سے بھی حضرت استاذ زادہ (مولانا راشدی صاحب) سے شعوری محبت، عقیدت اور تعلقِ خاطر ہے۔ اللہ ان کی دانش و حکمت اور اس علمی خانوادہ کے فیضان سے اہلِ علم کو تادیر مستنیر فرمائیں۔

ہم دارالمؤلفین کے رُکن جناب ڈاکٹر ضیاء الحق قمر کے خصوصی طور پر ممنون ہیں، ان کی مشاورت سے کئی مراحل طے ہوئے۔ ان خطبات کی کمپوزنگ، تخریج اور دیگر حوالوں سے ہمیں مولانا ضیاء الرحمٰن صاحب کا خصوصی تعاون حاصل رہا، اس مجموعۂ خطبات کی ترتیب اور تشکیل میں ان کے مشوروں سے بھی استفادہ جاری رہا، ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں۔

برادر گرامی حافظ میاں محمد نعمان صاحب (مہتمم جامعہ فتحیہ) کی علم دوستی کے سبب مولانا راشدی صاحب سے جامعہ میں اہلِ لاہور مستفید ہوئے ہیں۔ مہتمم صاحب اکثر خطبات میں اہتمام کے ساتھ شریک ہوئے۔ ہمارے ذمے مہتمم

صاحب کا اور برادر محترم میاں محمد عفان (ناظم جامعہ فتحیہ) کا شکریہ ازبس لازم ہے۔ ان کی توجہ، حسنِ انتظام اور اہلِ علم سے محبت واکرام ور مہمان نوازی کے سبب دانش وحکمت کی یہ بزم سجی رہی۔ اور اُن خطبات کی سماعت کے لیے دور دور سے تشنگانِ علم جامعہ فتحیہ تشریف لاتے رہے۔

جامعہ فتحیہ ڈیڑھ صدی کی دینی و تہذیبی روایات کا حامل عظیم علمی مرکز ہے۔ ان خطبات کے سبب جامعہ کی علم پروری کی تاریخ میں ایک روشن اور تابناک باب کا اضافہ ہوا ہے۔ رب تعالیٰ مولانا کی ذاتِ گرامی سے مستفیض فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اس سراجِ علم (جامعہ فتحیہ) کی ضوفشانی کو تادیر قائم رکھیں۔

تقدیم

از حافظ میاں محمد نعمان

یہ حقیقت ہے کہ جب تک اپنے عہد کی فکری و علمی آگہی نہ ہو تب تک نتیجہ خیز علمی مکالمے کا امکان نہیں رہتا۔ ہمارے جلیل القدر فقہاء نے اپنے عہد کے علمی چیلنجز کو قانونی اور تمدنی میدان میں قبول کر کے ان کا فقہی لٹریچر کی صورت میں شاندار جواب دیا۔ یہ جواب تبھی ممکن ہوا جب انھیں عصری تقاضوں سے کامل آگہی ہوئی۔ اس تناظر میں اہل علم کا یہ قول عصری علمی دانش کا مظہر ہے کہ من لم یعرف بعرف اھل زمانہ فھو جاھل (جو اپنے زمانے کے تقاضوں سے واقف نہ ہو تو وہ حقیقتاً جاہل ہے)۔

ہمارے عہد کی ایک محترم، ذی وقار اور نمایاں علمی شخصیت مولانا زاہد الراشدی صاحب کی ہے۔ آپ کو اللہ نے ایک طرف دینی روایت سے کامل ہم آہنگی کی بدولت رسوخ فی العلم سے نوازا ہے تو دوسری جانب آپ کی نمایاں خصوصیت عصرِ رواں اور بالخصوص مغربی فکر سے آگہی ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کے سبب حضرت راشدی صاحب کی شخصیت میں ایک خاص جامعیت اور توازن آگیا ہے۔

مولانا راشدی صاحب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے عہد کے تقاضوں کی جو بصیرت اور ان کا فہم عطا کیا ہے وہ خاصے کی چیز ہے۔ اسی تناظر میں آپ نے "احکام القرآن" کی عصری تطبیق اور توضیح پر فاضلانہ خطبات ارشاد فرمائے اور اُن خطبات میں اپنے عہد کے سوالات کا علمی انداز میں جواب دیا ہے۔ آج کی معاصر دُنیا جدید ذرائع ابلاغ اور سوشل میڈیا کی بدولت اپنے فوائد اور نقصانات سمیت تیز تر ہوگئی ہے۔ ان کے پھیلائے گئے مغالطوں کا ادراک، عالمی قوتوں کی گہری سیاسی چالیں، مذہب بیزاری، اور ترقی پذیر دنیا کے وسائل کا استحصال؛ ایسے مغربی مقاصد کا فہم جب تک نہ ہو تب تک جوابی حکمتِ عملی تیار نہیں کی جاسکتی۔ مولانا نے جامعہ فتحیہ میں دیے گئے ان خطبات میں مغرب کے مقابلے کی حکمتِ عملی کا نقشہ بھی پیش فرمایا اور اُن سے مکالمہ کرنے کے اسلوب کی بھی نشان دہی فرمائی ہے۔

ہمارے ہاں مطالعہ و فہمِ مغرب کا رجحان بہت کمزور ہے۔ ہمارے اکثر حلقے اہلِ مغرب کے متعلق یک طرفہ رائے رکھتے ہیں۔ دورانِ تعلیم مجھے مغرب کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، اس قیامِ مغرب کے مشاہدے کی روشنی میں جب تجزیہ کرتا ہوں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا فہمِ مغرب کا معیار سطحی ہے۔ ضرورت ہے کہ مغرب کو سیاسی اور تاریخی تناظر کے ساتھ ساتھ سماجی تناظر میں بھی سمجھا جائے۔ جہاں ان کی متعدّد خرابیاں اور کمزوریاں ہیں ان کی نشاندہی کر کے تجزیاتی انداز میں اس پر تبصرہ کیا جائے۔ ساتھ ہی اہلِ مغرب کی معاشرتی خوبیوں: پابندیٔ وقت اور صفائی و صحت وغیرہ کا بھی کھلے دل سے اعتراف کیا جائے۔

ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ مولانا زاہد الراشدی صاحب ان شخصیات میں سے ہیں جنھوں نے مغربی ممالک و امریکہ کے کثیر اسفار کیے اور اُن کے اہلِ دانش سے براہِ راست مکالمے کے ذریعے مغرب و امریکہ کو سمجھا ہے۔ اس لیے آپ کے ہاں یک طرفہ رائے اور ردعمل کی نفسیات نہیں ہے بلکہ وہ علمی مسلّمات کے ذریعے مغربی فکر کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ آج کی مذہبی دانش بھی مولانا کی طرح مغرب کو سمجھے تاکہ ہم مغرب و اہلِ مغرب کی پھیلائی گئی غلط فہمیوں سے آگاہ ہو سکیں۔ مولانا راشدی صاحب نے اہلِ مغرب سے معاندانہ انداز کی بجائے مفاہمتی اور باہمی مکالمہ کا اسلوب تجویز کیا ہے اور آج کے حالات میں اسی کی ضرورت ہے۔

مولانا کے یہ ''خطباتِ فتحیہ'' ہمارے لیے ایک علمی اعزاز ہیں۔ آپ نے رواں سادہ اسلوب میں مُحکم دلائل کے ساتھ اہلِ دین کا مقدمہ پیش کیا ہے۔ دینی مدارس کے تحفظ اور بقا کے لیے بڑی فراست اور جرأت کے ساتھ اپنا نقطہ نظر رکھا ہے۔ اور اہلِ مدارس کے لیے مستقبل کے راستوں کی نشاندہی بھی کی ہے۔ یقیناً یہ سلسلۂ خطبات اہلِ ذوق کے ہاں حسبِ روایت پذیرائی حاصل کرے گا۔ اور اہلِ علم حضرات اس طرح کے علمی خطبات کی روایت کو آگے بڑھائیں گے۔

میرے تعلیمی ساتھی (Class Fellow) اور جامعہ فتحیہ کے فاضل و خطیب مولانا ڈاکٹر حافظ محمد سعید عاطف صاحب نے ان خطبات کو بڑے اہتمام سے تحقیقی انداز سے مرتب کیا ہے، وہ ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ جامعہ فتحیہ کو اپنی روایت کے مطابق اہلِ علم، اربابِ تحقیق اور اصحابِ دانش کا مرکز بنائے؛ اور ہم دینِ متین کو اپنی روایت کی روشنی میں عصری تقاضوں کے مطابق دُنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں۔ رب تعالیٰ اس عہد کے اہلِ علم کو حضور اکرم ﷺ کی سنت کی تعبیر و تشریح اور اس کی عصری تطبیق کی توفیق سے نوازیں۔

سوال:

سورہ آل عمران میں اہل کتاب کے بارے میں کہا گیا ہے کہ ان میں مومن بھی ہیں اور وہ جو بھی نیک عمل کریں گے، اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔ اس کی روشنی میں تو لگتا ہے کہ اہل کتاب میں مومن ہو سکتے ہیں اور ان کے اعمال کا بھی اجر ان کو دیا جائے گا، جبکہ ہم تو اس کے برخلاف پڑھتے سنتے رہے ہیں۔

جواب:

اس مقام سے متعلق زیادہ تر مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہاں ان اہل کتاب کا ذکر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے۔ مراد یہ ہوئی کہ اہل کتاب میں زیادہ تر اگرچہ کافر ہیں، لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایمان قبول کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی رائے اس سے مختلف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں جس گروہ کی طرف اشارہ ہے، اس نے اس وقت تک ایمان کا اظہار تو نہیں کیا تھا، لیکن دل میں ایمان لا چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس ایمانی رویے کی تحسین فرمائی ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس حالت میں بھی وہ جو اچھے عمل کر رہے ہیں، اللہ ان کو ضائع نہیں کرے گا۔ اس کی تائید میں مولانا سورہ کی آخری آیت کا حوالہ دیتے ہیں جہاں ان اہل کتاب کے، سابقہ کتابوں اور قرآن دونوں پر ایمان رکھنے کا ذکر ہوا ہے۔

آیت کے اسلوب میں متعدّد قرائن مولانا کی رائے کی تائید کرتے ہیں۔ مثلاً اس گروہ کے لیے ”من اھل الکتب“ کا عنوان اختیار کیا گیا ہے جو بظاہر دائرہ اسلام میں داخل ہو جانے والوں کے لیے موزوں نہیں ہے۔ پھر ”وما یفعلوا من خیر فلن یکفروہ“ کی تسلی بھی اسی گروہ کے لیے موزوں دکھائی دیتی ہے کہ اس حالت میں بھی ان کے کیے ہوئے اعمال کو اللہ ضائع نہیں کرے گا۔ آخر میں ”واللہ علیم بالمتقین“ کا جملہ بھی اسی طرف مشیر ہے کہ اس گروہ کی باطنی اور مخفی حالت کا ذکر

ہو رہا ہے جو اگرچہ لوگوں پر ظاہر نہیں، لیکن اللہ اس کو بہر حال جانتا ہے۔

یہاں بنیادی مقصد اس گروہ کا اہل کتاب کے اس گروہ کے ساتھ تقابل کرنا ہے جو جانتے بوجھتے حق کا انکار کرتا تھا اور دنیوی مفادات کی خاطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب پر تلا ہوا تھا۔ ان کے مومن ہونے کی تحسین اس پہلو سے ہے کہ وہ اکثر اہل کتاب کے برخلاف، ما انزل اللہ میں فرق نہیں کرتے اور سابقہ کتابوں کے ساتھ قرآن پر بھی ایمان لاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس ایمانی رویے کی تعریف کرتے ہوئے انھیں بشارت دی گئی ہے کہ وہ اگرچہ ظاہراً ابھی اسلام میں داخل نہیں ہوئے، لیکن ان کی حق پرستی کی بدولت ان کے اعمال کو اللہ ضائع نہیں کرے گا۔

ایسے لوگوں کو جو دل میں ایمان لا چکے ہوں، لیکن اس کا اظہار نہ کر سکتے ہوں، ''مومن'' کہنا قرآن مجید کے اسلوب کے مطابق ہے اور اس کے واضح نظائر موجود ہیں۔ مثلاً مکہ میں جو مسلمان مرد اور عورتیں خفیہ ایمان لا چکے تھے، ان کو سورۃ الفتح میں ''رجال مومنون ونساء مومنات لم تعلموھم'' کہا گیا ہے، یعنی اگرچہ وہ ظاہراً مسلمانوں میں شامل نہیں لیکن اللہ کے علم کے مطابق وہ مومن ہیں۔ اسی طرح فرعون کے دربار میں خفیہ ایمان رکھتے ہوئے اپنی قوم کو موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کی طرف متوجہ کرنے والے کے لیے بھی ''رجل مومن من آل فرعون یکتم ایمانہ'' کا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔

مزید برآں شریعت کا ایک مستقل اصول بھی ہے کہ جو لوگ، مثال کے طور پر شاہ حبشہ نجاشی کی طرح، اپنے ایمان کا اظہار نہ کر سکیں اور ظاہراً اپنے دین کے پیروکار رہتے ہوئے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتے ہوں تو ان کا شمار بھی اللہ کے نزدیک اہل ایمان میں ہی ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنیاد پر نجاشی کی وفات پر ان کی غائبانہ نماز جنازہ بھی ادا فرمائی تھی۔ علمائے کلام کے ایک گروہ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ غیر مسلموں میں سے جو لوگ دل میں ایمان لے آئیں، لیکن اپنے حالات یا مجبوریوں کی وجہ سے ظاہراً اقرار نہ کریں، وہ دنیوی احکام کے لحاظ سے تو اہل کفر میں گنے جائیں گے، لیکن اخروی احکام میں اللہ تعالیٰ کے ہاں مومن ہی شمار ہوں گے۔ شافعی فقیہ علامہ خیر الدین الرملیؒ نے اپنے فتاویٰ میں اس سوال پر مختصر کلام کیا ہے اور امام الحرمین الجوینی اور امام غزالیؒ کے حوالے سے اس رائے کی تائید کی ہے۔

اگر اشیاء اور کیفیات کے ان گنت نام ہیں تو تلفظ ان پر مستزاد۔ کالے کو کوئی اسود کہے تو کوئی سیاہ۔ بلیک کہنے پر تسلی نہ ہو تو وہ ڈارک پر خوش ہو جائے۔ اس لسانی اختلاف کا خالق انہیں اپنی نشانیاں قرار دے تو اسی کے محرم راز صلی اللہ علیہ وسلم ان اختلافات کو رحمت کا سبب کہیں۔ شاید اسی وجہ سے ہم انسانوں میں گفتگو کا آغاز بالعموم اختلاف سے ہوتا ہے۔ اختلاف کے مختلف النوع پیرائے تہذیبِ انسانی کی پہچان ہیں جن میں حسنِ بیان، احترامِ آدمیت، سلیقہ اور آگے بڑھتے وقت پچھلا دروازہ بند نہ کرنے کا داعیہ ہو تو واپس مڑکر بھی انسان آگے ہی کو رہتا ہے۔ الٹے پاؤں چلنے والے کو اس کی فکری بالیدگی سیدھا رکھتی ہے، بھلے وہ الٹے پاؤں چلے۔

اپنے برصغیر کی زوال آشنا تہذیب کا نوحہ پڑھنے کا وقت شاید ابھی نہ ہو لیکن قعرِ مزلت کو لڑھکتی ”پہلے آپ، اجی نہیں صاحب، پہلے آپ“ والی اپنی اس خوبصورت تہذیب کی ناک میں اگر آپ کو آکسیجن کی نلی نظر نہ آئے تو برصغیر کے ٹی وی چینلوں پر چند مذاکرے بھگت لیجیے۔ تشنگی رہے تو فیس بک اور یوٹیوب پر چلے جائیے جہاں اختلاف رائے پر مبنی مکالمہ ”آپ جناب“ کو بھلا کر ابے تبے، تو تکار سے پھسلتا ہوا گالم گلوچ اور گاہے سر پھٹول کرتا بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ اگر آپ گوشہ نشین ہو کر ان چیزوں سے دور ہیں تو کسی واٹس ایپ گروپ میں آپ یقیناً ہوں گے۔ آپ نے وہاں بھی یہی کچھ دیکھا ہو گا۔

پروفیسر خورشید احمد رحمہ اللہ کی رحلت پر چند مضامین لکھتے ہوئے میں بعض اکابر دیوبند کا قدرے ناقدانہ ذکر کر بیٹھا جو میرا اپنا حاصلِ مطالعہ تھا۔ دوسروں کی رائے برعکس ہو سکتی ہے لیکن توسع دیکھیے کہ فقیہ دہر مولانا زاہد الراشدی نے میرا ایک مضمون ماہنامہ الشریعہ مئی میں من وعن شائع کر دیا۔ بعض قارئین نے اپنی اختلافی آرا مجھے لکھیں تو انہیں بھی مقدور بھر مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ لیکن جدہ میں مقیم محبی ڈاکٹر قاری عبد الباسط صاحب نے مجھے جدہ ہی کے محترم عبد الجبار سلفی صاحب کا محاکمہ ارسال کیا۔ اس میں میری تحریر پر بھرپور و مبسوط گرفت تھی۔ ان کو بھی مقدور بھر جواب دے دیا۔

پھر ان کا جواب الجواب آیا۔ آخر میں مجی عبد الباسط نے اسے یوں سمیٹا کہ ہم دونوں فارغ ہو گئے۔

ایک دن مجھے اچانک خیال آیا کہ ہم تینوں کی یہ مراسلت اگر شائع کر دی جائے تو ممکن ہے سوشل میڈیائی اسالیب ”مکالمہ“ میں کچھ ردوبدل اور ترمیم و اضافہ ہو۔ شاید کسی ایک کے دل میں یہ مراسلت اتر جائے۔ چنانچہ میں نے اپنے ان دونوں ممدوحین کو اذن اشاعت کی عرضی گزاری۔ دونوں نے بخوشی اجازت مرحمت کر دی۔ قارئین سے گزارش ہے کہ وہ روزنامہ پاکستان میں شائع میرے مضامین یا الشریعہ مئی 2025ء میں ان میں سے ایک مضمون کی مکرر اشاعت پڑھ کر اس مراسلت پر ناقدانہ نظر ڈالیں۔ پہلے میری مذکورہ تحریر پر محترم عبد الجبار سلفی کا محاکمہ ملاحظہ ہو جو محترم قاری ڈاکٹر عبد الباسط صاحب کے توسط سے مجھے موصول ہوا تھا:

جناب ڈاکٹر شہزاد اقبال کی تنقیدات اور اکابر دیوبند

چند دن قبل جدہ میں مقیم کاتب السطور کے کرم فرما اور نہایت صالح و ذی استعداد عالم دین جناب مولانا قاری عبد الباسط صاحب زید مجدہ نے ایک کالم کی جانب توجہ دلائی تھی۔ آج فرصت میں وہ کالم پڑھا تو زیرِ نظر قلم برداشتہ تحریر وجود میں آگئی جو پیشِ خدمت ہے۔ محترم ڈاکٹر شہزاد اقبال شام کا ایک کالم مورخہ 20 اپریل 2025ء کے روزنامہ پاکستان میں ”پروفیسر خورشید احمد، متبرک حلقہ ہائے زنجیر کی آخری کڑی“ کے زیرِ عنوان نظر سے گزرا، جس میں بعض تاریخی و فکری مبالغات اور اکابرِ امت پر تنقیدی اشارات نے علمی اضطراب کو جنم دیا۔ اس خاکسار نے طے کیا کہ ان اشارات و تنقیدات کا علمی، تحقیقی اور معروضی جائزہ پیش کیا جائے۔ فلہٰذا ذیل میں ڈاکٹر صاحب کے منتخب اقتباسات درج کر کے ان پر طائرانہ تبصرہ کیا جا رہا ہے۔

اقتباس اول: ”مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ اور ابوالکلام آزاد مرحوم جیسی قد آور شخصیات بھی ابھریں۔ اول الذکر کی فکر و میراث مسلکی تنگنائیوں میں یوں الجھی کہ آج یہ لوگ برصغیر اور اردگرد میں دین کے کسی جزیے کو لے کر چل رہے ہیں“۔

الجواب بعون اللہ الملک الوھاب: یہ جملہ مولانا نانوتویؒ کی شخصیت و خدمات سے شدید ناانصافی ہے۔ دارالعلوم دیوبند کا قیام، اس کے ذریعہ برصغیر کے لاکھوں علماء کی تربیت، حدیث، فقہ، تصوف اور دین کے جملہ شعبہ جات میں گراں قدر خدمات کوئی جزوی یا مسلکی کارنامہ نہیں بلکہ ایک ہمہ گیر علمی تحریک ہے۔ دیوبندیت کسی جزوِ دین کی قائل نہیں بلکہ قرآن و سنت پر مبنی پورے دین کی داعی ہے۔ امام الکبیر مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے ”تحذیر الناس“ جیسے عمیق مباحث اور ان کے مجددانہ افکار ہر

صاحبِ علم کے لیے مشعل راہ ہیں۔

اقتباس دوم: ''ابوالکلام آزاد اعلیٰ فکری خوبیوں کے باوجود افسوس وطنی قومیت کے آسیب کا شکار ہو کر شعلہ مستعجل بن گئے''۔

الجواب بعون اللہ الملک الوھاب: مولانا آزاد پر قومیت کے غلبے کی شکایت کی جا سکتی ہے، قطع نظر اس سے کہ یہی شکایت مولانا مودودی سے بھی کی جا سکتی ہے، مگر مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر قرآن مجید، ان کے خطبات، اور اسلامی تاریخ پر ان کی گہری نظر اس بات کی متقاضی ہے کہ ان کا ذکر ایک ''شعلہ مستعجل'' کے بجائے ایک عہد ساز مفسر، ادیب اور مفکر کے طور پر کیا جائے۔ ان کی ''ترجمان القرآن'' اسلامی علوم کا ایک گراں مایہ خزینہ ہے۔

اقتباس سوم: ''سید مودودی باہر نکل کر پاکستان ہی نہیں کُل عالَم کو اللہ کا گھر بنانے پر تل گئے''۔

الجواب بعون اللہ الملک الوھاب: یہ جذبہ اگرچہ قابلِ ستائش ہے، لیکن مولانا مودودی کی بعض تحریریں علمی نقد سے بالا نہیں۔ اکابرِ دیوبند مثلاً مفتی محمد شفیع، مولانا ظفر احمد عثمانی، مولانا محمد سرفراز خان صفدر، قائد اہل سنت مولانا قاضی مظہر حسین رحمہم اللہ اور دیگر بزرگوں نے ان کی بعض آراء پر دلائل کے ساتھ تنقید کی ہے، خصوصاً خلفائے راشدین پر تنقیدی اسلوب، اور فقہائے کرام سے بے نیازی جیسے امور انہیں دیوبندی اکابر کے فکری تسلسل سے الگ کرتے ہیں۔

اقتباس چہارم: ''نتیجہ نکلا کہ شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، علامہ اقبال اور سید مودودی کا دمکتا ہوا تسلسل پروفیسر خورشید احمدؒ ہی تھے۔''

الجواب بعون اللہ الملک الوھاب: یہ دعویٰ مبالغہ آمیز ہے۔ پروفیسر خورشید احمد بلاشبہ ماہرِ معیشت اور اسلامی فلاحی ریاست کے علمبردار ہوں گے، لیکن انہیں ان حضرات کا جامع تسلسل قرار دینا تاریخی ترتیب، فکری رسوخ، اور دینی جامعیت کے اعتبار سے درست نہیں۔ کیونکہ حضرت مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ کا تسلسل دراصل اکابرِ دیوبند میں محفوظ و متحرک ہے۔

اقتباس پنجم: ''مرحوم بلاشبہ چاروں مذکورہ بالا شیوخ کے سلسلے کی آخری کڑی تھے''۔

الجواب بعون اللہ الملک الوھاب: فکری اور روحانی تسلسل کبھی کسی ایک فرد پر ختم نہیں ہوتا۔ اسلامی تاریخ کی روح یہی ہے کہ ہر صدی میں مجددین، مصلحین، اور علماء حق اس تسلسل کو آگے بڑھاتے ہیں۔ آج بھی علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کے تلامذہ اس تسلسل کو عزت، تدبر اور توازن کے ساتھ

سنبھالے ہوئے ہے، ڈاکٹر شہزاد اقبال شام کی نیت اپنی جگہ نیک ہوگی اور ان کی اپنے ممدوحین سے محبت بھی خالص ہوگی، مگر انصاف کے ترازو پر تولیں تو اکابر دیوبند کی ہمہ گیر دینی خدمات اور فکری رسوخ کسی جزوی، مسلکی یا محدود دائرے کا نام نہیں، بلکہ وہی شاہ ولی اللہی فکر کا اصل تسلسل ہے جو علم، تصوف، دعوت، سیاست، اور معیشت سب پر محیط ہے۔ مودودی صاحب اور پروفیسر خورشید احمد کی انفرادی خوبیوں کا اعتراف ضرور کریں کہ وہ آپ کی جماعتی وفکری وابستگی کا حق ہے، لیکن تنقیدی توازن کے بغیر انہیں اکابرامت پر ترجیح دینا کسی علمی دیانت سے مطابقت نہیں رکھتا۔

(عبدالجبار سلفی، 27 اپریل 2025ء لاہور)

یہ مکتوب مجھے قاری ڈاکٹر عبدالباسط صاحب کے توسط سے موصول ہوا تھا لہٰذا میں نے اپنا درج ذیل معروضہ انہی کی خدمت میں پیش کیا۔ تاہم اس کی نقل محترم جناب عبدالجبار سلفی صاحب کو ارسال کر دی۔ معروضہ ملاحظہ ہو:

محترم جناب ڈاکٹر قاری عبدالباسط صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

دو دن پہلے مجھے آپ کے توسط سے محبی عبدالجبار سلفی صاحب کا مکتوب بسلسلہ میری ایک تحریر کے موصول ہوا۔ محترم عبدالجبار سلفی صاحب نے جس متوازن اور دل نشین پیرائے میں اپنے نقطہ نظر کا ابلاغ کیا ہے، یقین جانیے دل سے ان کے لیے دعائیں نکلی ہیں۔ ڈاکٹر غازی رحمہ اللہ نے ایک دفعہ بڑی حسرت سے کسی معاملے میں اپنا دل چیر کر میرے آگے یوں رکھا تھا: ''میری یہی خواہش ہے کہ اہل علم ایک دوسرے کا احترام کرنا سیکھ جائیں۔'' حق یہ ہے کہ محبی عبدالجبار سلفی نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا ہے۔ اللہ انہیں جزا دے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ میری تحریر میری سوچ کی عکاس ہے جو سوچ سمجھ کر اس ایمان کے ساتھ لکھی ہے کہ مذکورہ جملہ ممدوحین کا مرتبہ ومقام اس دنیا کے احوال کے مطابق ہے۔ رہا اللہ کے ہاں ان کا تقرب تو وہ نہ مجھے پتا ہے نہ کسی اور کو۔ ممکن ہے اللہ کا قرب حاصل کرنے میں میرے ممدوح وہ مرتبہ نہ پا سکیں جو آپ کے ممدوح لے پائیں (اگرچہ یہ تمام بزرگان دین ہم دونوں کے ممدوحین ہیں) اور اسی کو آپ بالعکس بھی متصور کر لیجیے۔ میں نے تو اپنے فہم کے مطابق ایک تجزیہ کیا تھا۔ نہ تو، اللہ معاف کرے، کسی کو نیچا دکھانا مطلوب تھا اور نہ کسی کی فوقیت ثابت کرنا میرے پیش نظر تھا۔

جو باتیں محترم عبدالجبار سلفی نے نسبتاً اختلافی پیرائے میں بیان کی ہیں، صاحب میرا تو اپنا وہی نقطہ نظر ہے۔ مولانا قاسم نانوتوی رحمہ اللہ نے تو اس برصغیر کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ بہت کم لوگوں کی توجہ

ادھر جا پاتی ہے کہ سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ کی تحریک کی کم و بیش 90-95 فیصد اٹھان علمائے دیوبند کی تحریک اور انہی کے تربیت یافتہ افراد پر ہے۔

علمائے دیوبند کے دین کو کلی طور پر لے کر چلنے کے بارے میں اب یوں کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ چند دہائیوں سے، بالخصوص پاکستان میں، واقعتاً ایسے ہی ہے جیسے آپ نے بیان کیا ہے۔ اس کی ایک بڑی اور روشن مثال عالی مقام مولانا زاہد الراشدی ہیں۔ بلا شبہ مولانا اجتہادی بصیرت سے مالا مال ہیں۔

مجھے خوشی ہوئی کہ محترم عبد الجبار سلفی صاحب کے لیے میری قدرے ناپسندیدہ تحریر کے سبب مجھے اپنے سے کہیں بہتر بھائی کا تعارف حاصل ہوا۔ میں ان کی یہ تحریر سنبھال کر رکھتا ہوں اور موقع بہ موقع اس سے روشنی لیتا رہوں گا۔

شہزاد اقبال شام 29 اپریل 2025ء

محترم عبد الجبار سلفی صاحب نے میری ان وضاحتوں کا جو جواب الجواب دیا، اب وہ ملاحظہ کیجیے:

بخدمت گرامی قدر، محترم المقام جناب شہزاد اقبال صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر و عافیت ہو گا۔ آپ جناب کے ایک بصیرت افروز کالم پر راقم نے نہایت اخلاص کے ساتھ ایک برادرانہ تبصرہ پیش کیا تھا، جس پر آپ کی وسعتِ ظرف، شگفتہ مزاجی اور دل نوازی نے جس محبت و شفقت کا مظاہرہ فرمایا، وہ میرے لیے باعثِ افتخار و انبساط ہے۔ آپ جیسے اصحابِ علم و وقار کا تعلق دلوں کو وقار بخشتا ہے، اور جن کی صحبت میں فہم و ادراک کے دریچے وا ہوتے ہیں۔ میری دل کی گہرائیوں سے دعا ہے کہ ربّ کریم آپ کو ہمہ وقت صحت و عافیت کے حصار میں رکھے، آپ کی فکر و دانش کو مزید جِلا عطا فرمائے، اور آپ کا قلم ہمیشہ سچائی، خیر اور علم کے فروغ کا علم بردار بنا رہے۔ میں اس برادرانہ تبادلہ خیالات کو اپنی زندگی کی نیک ساعتوں میں شمار کرتا ہوں، اور امید رکھتا ہوں کہ آئندہ بھی آپ کی علمی صحبت سے کسبِ فیض کا سلسلہ قائم رہے گا۔

(عبد الجبار سلفی لاہور)

اس تحریری "دنگل" پر کسی کے بیچ بچاؤ کرانے کی چنداں ضرورت نہیں تھی لہٰذا مراسلت کی درج ذیل آخری کڑی کو مصالحت نامہ نہ سمجھ لیجئے۔ قاری ڈاکٹر عبد الباسط صاحب کا درج ذیل محبت نامہ میرے لیے کتنا گراں قدر ہے یہ میں ہی جانتا ہوں۔۔ یہ کوئی روایتی مکتوب نہیں، یہ ان کی وہ شہادت ہے جسے میں نے "وہاں" کے لیے رکھ لیا ہے۔ مکتوب ملاحظہ

ہو:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، میرے انتہائی صد احترام بلکہ واجب احترام مکرم محترم عزیز بھائی جناب ڈاکٹر شہزاد اقبال شام صاحب۔

میرے دل میں آپ کا جو احترام اور محبت پہلے سے تھی اور محترم جناب بھٹہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ واسکنہ فسیح جناتہ... ان کے ہاں کئی بار ملاقات اور گفتگو بھی رہی۔۔ وہ مقام اب آپ کی اس تحریر کے بعد کئی گنا زیادہ بڑھ گیا ہے۔ آپ نے حضرت ڈاکٹر غازی صاحب رحمہ اللہ کا ذکر خیر اور ان کا تاریخی جملہ بھی تحریر فرمادیا۔ یقیناً یہی دراصل وہ حسن وجمال ہے جو اختلافِ اُمتی رحمۃ... والے جملہ میں پوشیدہ ہے۔ آپ کا اپنی تحریر ومضمون کے بارے میں یاددھانی اور بعض ملاحظات پر جو میرے انتہائی قابل قدر ساتھی مولانا عبد الجبار سلفی صاحب نے لکھے، ان پر جو ردعمل سامنے آیا وہ آپ کے بڑے پن اور اس اصل شخصیت کا روپ ہے جو علم نافع کے شام تلے پلی بڑھی اور جسے مشاہیر اہل علم وعمل کی طویل دیرینہ صحبتوں نے چار چاند لگا دیئے۔ یہ انہی بڑوں کی تربیت ہے جن جن مشاہیر میں سے اکثر کا ذکر آنجناب کی تحریروں میں آتا رہتا ہے۔ سید مودودی رحمہ اللہ جیسی عبقری شخصیت ہو یا ان کے بعض جانشینوں کا ذکر مبارک، ہمارے برصغیر میں اگر یہ روشنی شروع دن سے عام ہو جاتی جسے رواداری اور عدل وتوازن کہا جاتا ہے تو یہ دوریاں نہ ہوتیں جن کی وجہ سے دین کی نسبتوں والے آج بھی ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے کہ آپ نے اس تاریک ترین تعصب زدہ ماحول میں بھی حسن تکلم، جمال قلم، ذخیرۂ علم ادب اور ہر صاحبِ علم کا دلی احترام جیسی صفات لئے اپنا علم بلند کیا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کا حامی وناصر ہو۔ اللہ گواہ ہے، عرب کہتے ہیں یعلم اللہ۔ میرے دل میں آپ کا جو احترام ہے، مجھے حیا آئی اور ادب مانع ہوا کہ آپ کی اس مذکورہ تحریر پر کچھ کہوں۔ سلفی صاحب سے تذکرہ ہوا تو دورانِ گفتگو عرضی پیش کر دی۔ ساتھ میں تاکید بھی کر دی کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا میرے دل میں جو مقام ہے اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جائے۔ بہرحال مجھے خوشی ہوئی کہ ان کا مضمون آپ کی نظر میں بھی معقول ہی رہا بلکہ یہ ہم سب کے قریب سے قریب تر ہونے کا ذریعہ بن گیا۔

واللہ ہو الموفق وہو ولی ذٰلک والقادر علی کل شیء

آپ کا بھائی عبد الباسط محمد جدہ

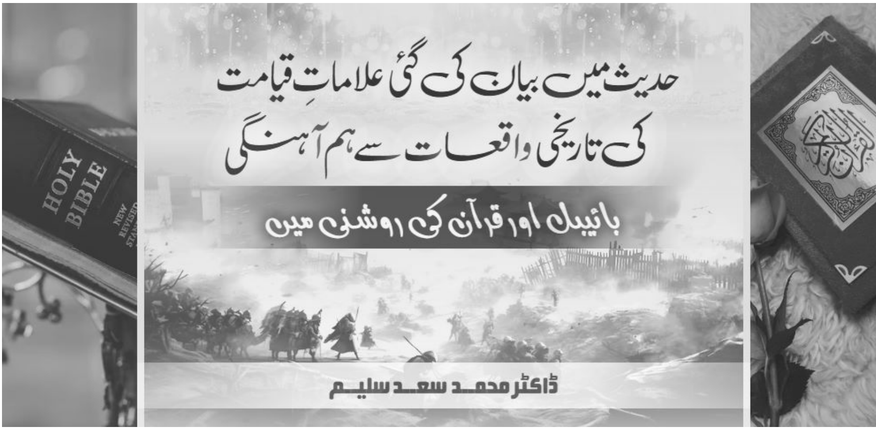

دجال — جھوٹے مسیح کی آمد

دجال، جس کا مطلب "بڑا جھوٹا" ہے، کو "المسیح الدجال" بھی کہا جاتا ہے، جس کا ترجمہ "جھوٹا مسیح" ہے۔ "مسیح" (عبرانی مشیاح سے، جس کا مطلب "مسح کیا گیا" ہے) قدیم اسرائیل میں ان افراد کے لیے استعمال ہوتا تھا جو بادشاہ، نبی یا کاہن کے طور پر خدا کی طرف سے چنے جاتے اور تیل سے مسح کیے جاتے۔ وقت کے ساتھ، مسیح کا تصور محض ایک مسح شدہ فرد سے نجات دہندہ کے تصور میں تبدیل ہوگیا، جو تاریخی جدوجہد، نجات کی امیدوں اور مذہبی تشریحات کا نتیجہ ہے۔

اسی سیاق میں، مسیح الدجال وہ ہستی ہے جو خود کو نجات دہندہ کے طور پر پیش کرتی ہے اور انسانی فطرت میں موجود مصائب و مشکلات سے نجات کی امید سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ یہ نجات کی طلب بذاتِ خود کسی مخصوص مذہبی پہلو کی حامل نہیں ہوتی۔ روایات کے مطابق، اس کی پیشانی پر "کافر" لکھا ہوگا، جو اس بات کو تقویت دیتا ہے کہ دجال خدا کا منکر ہوگا، اور نتیجتاً اس کے وعدے کسی الہامی یا مذہبی بنیاد پر نہیں ہوں گے۔

زمین کے جانور کے برعکس، جو محض طاقت اور جبر کی علامت ہے، دجال انسانی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے بعد کے ادوار میں بابلی سلطنت کو انسانی شکل میں پیش کیا گیا۔[34] اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دجال محض ایک عسکری قوت پر مبنی سلطنت نہیں، بلکہ ایک ایسی ریاست ہے جو گمراہ کن عقائد کے ساتھ لوگوں کو اپنے جھوٹے وعدوں پر یقین دلاتی ہے۔

دجال کی شناخت

دجال کی شناخت کے لیے احادیث میں اس کے ظہور سے قبل پیش آنے والے واقعات اور اس کی نمایاں خصوصیات کو درجِ ذیل میں بیان کیا گیا ہے۔

دجال کے ظہور سے پہلے کے واقعات

دجال کی آمد سے پہلے، متعدّد احادیث میں مسلمانوں کی تاریخ کے چار اہم واقعات کا ذکر ملتا ہے، جو نہ صرف مسلم و عیسائی کشمکش کے بڑے سنگ میل ہیں، بلکہ امت کی اجتماعی آزمائش کا بھی مظہر ہیں۔ یہ چار واقعات درج ذیل ہیں:

۱. جنگ یرموک — جس میں مسلمانوں نے بازنطینی (رومی) سلطنت کو فیصلہ کن شکست دی۔
۲. پہلی صلیبی جنگ کا معرکۂ انطاکیہ — جو شام کے شمالی علاقے میں پیش آیا اور صلیبی یلغار کا نقطۂ آغاز بنا۔
۳. قسطنطنیہ کی فتح — جس کے ذریعے عثمانی ترکوں نے بازنطینی دارالحکومت پر مسلم پرچم لہرایا۔
۴. پہلی جنگِ عظیم کے بعد عثمانی سلطنت کا زوال — جب خلافت نے اتحادی افواج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

اگرچہ ان واقعات کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، لیکن ان میں ایک گہرا ربط موجود ہے۔ پہلے تین واقعات کا تعلق رومی (بازنطینی) سلطنت سے ہے، جبکہ آخری تین واقعات میں ترک مسلمان نمایاں کردار ادا کرتے ہیں، جو اناطولیہ میں آباد ہو کر اسلامی دنیا کا عسکری و سیاسی مرکز بنے۔

رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان بڑی جنگ - جنگ یرموک (636ء)

حدیث[35] میں بیان کیا گیا ہے کہ، ایک شدید جنگ شام سے آنے والی فوج سے ہوگی جس میں مسلمان شہادت یا فتح کے عزم کے ساتھ لڑیں گے۔ ابتدائی تین دنوں کی لڑائی میں دونوں فریق سخت نقصان اٹھائیں گے مگر کوئی فیصلہ کن نتیجہ نہیں نکلے گا۔ چوتھے دن مسلمانوں کا دستہ دشمن کو شکست دے گا۔ جنگ اتنی خوفناک ہوگی کہ فضا میں اڑنے والا پرندہ بھی اس کے اثرات سے بچ نہ سکے گا۔ آخر میں، اتنے زیادہ لوگ قتل کیے جائیں گے کہ جنگ کے بعد گنتی کی جائے گی تو سو میں سے صرف ایک شخص زندہ بچے گا۔

یہ واقعہ حدیث میں نبی کریم ﷺ کی وفات کے جلد ہی بعد پیش آنے والے عظیم الشان معرکہ، جنگِ یرموک، کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو شام کے بازنطینی عیسائیوں کے خلاف لڑی گئی۔ یہ جنگ چھ دنوں تک جاری رہی، جن میں پہلے دن ابتدائی جھڑپیں اور حالات کا جائزہ لینے کی کوششیں ہوئیں، جبکہ پانچویں دن بازنطینوں کی طرف سے جنگ بندی کی پیشکش اور آخری معرکے سے پہلے از سرِ نو صف بندی کی گئی۔ اسی لیے حدیث میں صرف چار دنوں کی شدید لڑائی کا ذکر آیا ہے۔

دوسرے، تیسرے اور چوتھے دن سخت ترین معرکے دیکھنے میں آئے، جن میں جانی نقصان بھی غیر معمولی تھا۔ ان دنوں میں مسلمان افواج کی صفوں کو مجتمع رکھنے اور دشمن کے شدید دباؤ کو روکنے میں برق رفتار گھڑسواروں نے جان ہتھیلی پر رکھ کر کلیدی کردار ادا کیا۔ ان میں خصوصًا حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل اور اُن کے چار سو جان نثار مجاہدین شامل تھے،

جنہوں نے اپنی جانوں کی پروا کیے بغیر دشمن پر ٹوٹ پڑنے کی حکمتِ عملی اپنائی — جو حدیث میں مذکور 'شرطۃ الموت' یعنی موت کے دستے کی عملی تفسیر معلوم ہوتی ہے۔[36]

چھٹے دن — جو کہ حقیقی معنوں میں شدید لڑائی کا چوتھا دن تھا — مسلمانوں نے فیصلہ کن حملہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علمبرداروں کو شاندار فتح عطا فرمائی، اور بازنطینی افواج مکمل طور پر پاش پاش ہوگئیں۔ اس جنگ میں مسلمانوں کو بھی بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ میدان جنگ کے اوپر پرندوں کا نہ گزر سکنے کی تفصیل میدانِ جنگ میں تیروں کی بارش اور گرد و غبار کے اٹھنے کو ظاہر کرتا ہے، جو جنگ کی شدت کی طرف اشارہ ہے۔ یہ جنگ تاریخ عالم کے ایک اہم موڑ کے طور پر دیکھی جاتی ہے، جس نے شام میں مسلمانوں کے غلبے کی بنیاد رکھی۔

رومیوں کا دابق یا اعماق میں اترنا اور مسلمانوں سے لڑنا - پہلی صلیبی جنگ کا معرکہ انطاکیہ (1098ء)

حدیث[37] میں رومیوں کا دابق یا اعماق میں اترنا، مدینہ سے بہترین سپاہیوں پر مشتمل فوج کا ان کے مقابلے کے لیے آنا، رومیوں کا مسلمانوں کے قبضے سے جنگی قیدیوں کو چھڑانے کا مطالبہ اور ایک تہائی مسلمانوں کا فرار، ایک تہائی کا شہید ہونا اور ایک تہائی مسلمانوں کا کبھی آزمائش میں نہیں ڈالا جانا بیان کیا گیا ہے۔

یہ منظرنامہ تاریخ میں پہلی صلیبی جنگ کے دوران واضح طور پر سامنے آیا، جب بازنطینی سلطنت نے سلجوقی ترکوں کے خلاف فوجی مدد کے لیے یورپی عیسائی طاقتوں کو پکارا۔ اس جنگ کا ایک بڑا مقصد، عیسائیوں کے مقدس مقامات — بالخصوص یروشلم — کو مسلمانوں کے قبضے سے 'آزاد' کرانا تھا۔ احادیث میں صلیبیوں کے اس عزائم کو اس انداز میں پیش کیا گیا ہے گویا ان کے نزدیک یہ مقدس مقامات مسلمانوں کی قید میں تھے، جنہیں وہ ہر قیمت پر بازیاب کرانا چاہتے تھے۔

پہلی صلیبی جنگ میں صلیبیوں نے اناطولیہ میں فتوحات کے بعد شمالی شام کا رخ کیا۔ ان کا پہلا بڑا ہدف انطاکیہ تھا، جو اس خطے کا ایک مرکزی اور کلیدی شہر تھا۔ شمال کی جانب سے انطاکیہ تک پہنچنے کے لیے وہ ماراش کے پہاڑی علاقوں سے گزرتے ہوئے اعماق[38،39،40] میں اترے[41]، وہی میدان جس کا ذکر احادیث میں بھی ملتا ہے۔

انطاکیہ پر صلیبیوں کے قبضے کے بعد، موصل کے اتابک، ترک سپہ سالار کربوغا کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک عظیم لشکر انطاکیہ کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ یہ فوج مسلمانوں کے مشہور اور تجربہ کار جنگجو گروہوں پر مشتمل تھی۔ مسلم مورخ ابن الاثیر کے مطابق، یہ لشکر پہلے دابق میں پڑاؤ ڈالتا ہے، اور پھر انطاکیہ کی طرف بڑھتا ہے۔[42] حدیث میں جس "مدینہ سے نکلنے والی فوج" کا ذکر ہے، وہ دراصل مسلمانوں کی افواج کی علامت ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں مدینہ منورہ مسلمانوں کی ریاست کا مرکز تھا اور لشکر وہیں سے روانہ ہوا کرتے تھے۔

حدیث کے مطابق مسلمانوں کے تین گروہوں کا ذکر ملتا ہے:

۱. ایک تہائی وہ جو میدانِ جنگ سے فرار اختیار کریں گے: ابن الاثیر بیان کرتے ہیں کہ جنگ کے دوران تقریباً پوری مسلمان فوج میدان چھوڑ کر بھاگ گئی، سوائے ایک چھوٹے سے دستے کے۔[43] حدیث کے مطابق یہ فرار کی راہ اختیار کرنے والا گروہ ہے جنہیں اللہ کبھی معاف نہیں کرے گا۔

۲. ایک تہائی وہ جو شہید ہوں گے: ابن الاثیر کے مطابق ایک چھوٹے سے دستے کے مجاہدین، جو سرزمینِ مقدس سے تعلق رکھتے تھے، ثابت قدم رہے اور انہوں نے اللہ کی رضا اور شہادت کی طلب میں لڑائی جاری رکھی۔ صلیبی فوج نے ان میں سے ہزاروں کو شہید کر دیا۔[44] یہی وہ لوگ ہیں جنہیں حدیث میں "افضل الشہداء" یعنی "سب سے بہترین شہداء" قرار دیا گیا ہے۔

۳. اور ایک تہائی وہ جنہیں آزمائش میں کبھی ڈالا ہی نہیں جائیگا: یعنی وہ ترک مسلمان جنہوں نے پہلی نو صلیبی جنگیں (1096-1272)، جو بنیادی طور پر عیسائیوں کے مقدس مقامات کے حصول کے لیے لڑی گئیں، میں حصہ نہیں لیا۔

یہ تقسیم انطاکیہ کی لڑائی میں مسلمانوں کی شکست کی علامت ہے۔

اس جنگ کے اثرات تاریخ پر بہت گہرے رہے، کیونکہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد اور عسکری قوت صلیبیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔ تاہم، اس غیر متوقع شکست نے صلیبیوں کو مزید حوصلہ دیا، جس کے نتیجے میں وہ 1099 میں یروشلم پر حملہ آور ہوئے اور بالآخر اسے فاطمیوں سے چھیننے میں کامیاب ہو گئے۔

مسلمانوں کا قسطنطنیہ کو فتح کرنا (1453ء)

حدیث[45] میں ایک تہائی مسلمانوں کا جیت جانا اور قسطنطنیہ کو فتح کرنا، جنہیں آزمائش میں کبھی نہیں ڈالا گیا، ان ترک مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے جنہوں نے پہلی نو صلیبی جنگیں (1096-1272)، جو بنیادی طور پر عیسائیوں کے مقدس مقامات کے حصول کے لیے لڑی گئیں، کے دوران صلیبی جنگوں میں حصہ نہیں لیا۔ اس گروہ نے سلطنت عثمانیہ کے تحت 1453 میں قسطنطنیہ کو فتح کر کے مشرقی رومی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔

مسلمانوں کا تلواریں لٹکانا اور دجال کا ظہور — عثمانی سلطنت کا ہتھیار ڈالنا (1918ء) اور سوویت یونین کا قیام (1922ء)

حدیث[46] میں بیان کیا گیا ہے کہ جب تلواریں زیتون کے درختوں پر لٹکا کر مالِ غنیمت کو تقسیم کیا جا رہا ہو گا، شیطان پکارے گا: "مسیح تمہارے گھروں میں داخل ہو گیا ہے!" یہ خبر سن کر مسلمان روانہ ہوں گے، لیکن یہ جھوٹ ہو گا۔ پھر جب وہ شام پہنچیں گے اور جنگ کے لیے صف بندی کر رہے ہوں گے، عین اسی وقت دجال نمودار ہو جائے گا۔

یہاں "تلواریں درختوں سے لٹکانے" سے مراد 1918 میں معاہدۂ مدروس کے تحت عثمانی سلطنت کا ہتھیار ڈالنا ہے، جبکہ "مالِ غنیمت کی تقسیم" درحقیقت فاتح قوتوں — برطانیہ، فرانس، اٹلی اور یونان — کے درمیان عثمانی علاقوں اور وسائل کی تقسیم کی علامتی تعبیر ہے۔

انہی ایام میں کمیونزم ایک عالمی طاقت کے طور پر ابھرا، اور 1920ء میں آذربائیجان، آرمینیا اور عثمانیوں کے کئی سابقہ علاقوں پر کمیونسٹوں نے قبضہ کر لیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جسے حدیث میں شیطان کی پکار "مسیح تمہارے گھروں میں داخل ہو گیا ہے!" کے ذریعے علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ شیطان کی جانب سے مسیح کے ظہور کا یہ جھوٹا اعلان دراصل اُس کمیونسٹ پروپیگنڈے کی نمائندگی کرتا ہے، جس کے ذریعے کمیونسٹ ریاست کو ایک نجات دہندہ کے طور پر پیش کیا گیا — ایسی ریاست جو عوام کو سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ استحصال سے "رہائی" دلانے، اور مزدوروں و کسانوں کے لیے "برابری" اور سوشلسٹ نظام کی شکل میں ایک مثالی معاشرتی خواب کو حقیقت بنانے کا دعویٰ کر رہی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شام عیسائیوں کے زیرِ تسلط تھا، لہٰذا مسلمانوں کا شام پہنچنا علامتی طور پر 1920 میں معاہدۂ سیورے کے تحت یورپی عیسائی فاتحین کے عثمانی سلطنت کے علاقوں پر باضابطہ قبضے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اسی طرح، احادیث میں بیان کردہ مسلمانوں کی "صف بندی" ترکی میں ایک نئی سیاسی ترتیب کے قیام کی علامت ہے۔ نومبر 1922 میں ترکی کی قومی اسمبلی نے باضابطہ طور پر عثمانی سلطنت کے خاتمے کا اعلان کیا، اور اسی دوران، دسمبر 1922 میں، سوویت یونین کا قیام عمل میں آیا — یہ وہی لمحہ تھا جب روایات کے مطابق دجال کا ظہور ہوا۔

مسلمانوں کے دس گھڑسوار — ترکی کی قومی تحریک کے دس راہنما

حدیث میں آتا ہے کہ جب مسلمان دجال کی خبر سنیں گے تو وہ ہر چیز چھوڑ کر دس گھڑسواروں کو طلیعہ (پیش رو دستہ) کے طور پر روانہ کریں گے، جو اس دن کے بہترین گھڑسوار ہوں گے۔ [47]

یہ منظر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتابِ مکاشفہ میں بیان کردہ گھڑسواروں کی مانند ہے، جہاں گھڑسوار قیادت اور رہنمائی کی علامت کے طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ [48] مذکورہ حدیث میں بھی ان دس گھڑسواروں سے مراد مسلمانوں کے دس راہنما ہیں۔ ان کی تعبیر ترکی کی قومی تحریک کے وہ دس نمایاں سیاسی و عسکری شخصیات ہیں جنہوں نے ابتدا میں کمیونسٹوں اور بعد ازاں مغربی طاقتوں سے کامیاب مذاکرات کیے [49]۔ حدیث میں ان کو اس دن کے بہترین گھڑسوار بتایا گیا ہے، جو درحقیقت بطور سفارت کار اور رہنما ان کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو ظاہر کرتا ہے۔ ان میں خاص طور پر مصطفیٰ کمال اتاترک، یوسف کمال ٹینگیر شینک، کازم کارابیکر اور بعد میں عصمت انونو جیسے رہنماؤں نے بے مثال سفارتی مہارت کا مظاہرہ کیا اور کمیونسٹوں اور مغربی طاقتوں دونوں سے بہترین معاہدے حاصل کیے۔ 1921 میں ترکی کی قومی تحریک نے کمیونسٹوں کے ساتھ سرحدوں کے تعین اور مالی امداد اور عسکری حمایت پر معاہدے کیے، لیکن تحریک کے رہنماؤں نے ترکی کو

کمیونزم کے نظریاتی اثر سے محفوظ رکھنے میں کامیابی حاصل کی۔[50] بعد ازاں 1923 میں معاہدہ لوزان کے ذریعے مغربی طاقتوں سے مکمل خود مختاری حاصل کی اور عثمانی سلطنت کے برعکس ترکی کو نوآبادیاتی تسلط سے بچایا۔ یہ ایک نادر سفارتی کامیابی تھی، جس میں ترکی نے دونوں عالمی طاقتوں سے فائدہ اٹھایا مگر کسی کا تابع نہیں بنا۔

بنی اسحاق کے ستر ہزار افراد – باکو شہر کے شیعہ مسلمان (1918ء-1920ء)

حدیث[51] میں ایک ایسے شہر کا ذکر ملتا ہے جس کی ایک سمت خشکی اور دوسری سمت سمندر ہے۔ بنی اسحاق کے ستر ہزار افراد بغیر اسلحہ کے اس شہر پر حملہ کریں گے، اور "لا إله إلا الله والله أکبر" کے تین بار کہنے کے بعد یہ شہر ان کے لیے کھل جائے گا۔ شہر پر قبضے کے بعد وہ مالِ غنیمت اکٹھا اور تقسیم کریں گے، لیکن دجال کے ظہور کی خبر سنتے ہی لوٹ جائیں گے۔

اس حدیث کی تعبیر موجودہ آذربائیجان کے دارالحکومت باکو کے 15 ستمبر 1918 کے واقعات ہیں۔ یہ شہر بحرِ خزر کے کنارے واقع ہے—ایک طرف خشکی اور دوسری طرف سمندر۔ اس پیشگوئی میں شیعہ مسلمانوں کو علامتی طور پر "بنی اسحاق" سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح بنی اسحاق،[52] حضرت ابراہیمؑ کے پیروکار ہونے کے باوجود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ایک علیحدہ مذہبی شناخت رکھتے تھے، اسی طرح شیعہ مسلمان بھی رسول اللہ ﷺ کے بعد اسلام کے اندر ایک مسلکی امتیاز کے حامل گروہ کے طور پر سامنے آئے۔[53] حدیث میں بنی اسحاق کی 'ستر ہزار' کی تعداد کا ذکر دراصل اُس وقت باکو میں موجود شیعہ آبادی کی طرف اشارہ ہے، جو تقریباً ستر ہزار کے قریب تھی۔[54]

تاریخی طور پر باکو میں 15 ستمبر 1918 کو عید الاضحیٰ کا دن تھا،[55] جب پہلی جنگ عظیم کے دوران عثمانی افواج باکو میں داخل ہوئیں۔[56] برطانوی اور آرمینیائی افواج ایک رات قبل ہی باکو کا انخلا کر چکی تھیں،[57] جس کے باعث عملی طور پر شہر کا دفاع ختم ہو چکا تھا۔ حدیث میں ذکر کردہ "لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ" کے الفاظ اس دن عید الاضحیٰ کی مناسبت سے ایامِ تشریق کی تکبیروں کو ظاہر کرتے ہیں۔ حدیث کے مطابق تین مرتبہ یہ کلمات کہے جانے کے بعد شہر کا "کھل جانا" علامتی طور پر عید الاضحیٰ کے تیسرے دن، مقامی شیعہ آبادی کی نمائندہ آذربائیجان ڈیموکریٹک ریپبلک کی جلاوطن قیادت کا واپس آنا اور باکو میں 17 ستمبر 1918 کو باقاعدہ اپنی حکومت قائم کرنا ہے۔[58]

حدیث میں مذکور "مالِ غنیمت" سے مراد اُس دور میں باکو کے وسیع تیل کے ذخائر ہیں، جن پر آذربائیجان ڈیموکریٹک ریپبلک کی شیعہ مسلمان قیادت کو عارضی طور پر کنٹرول حاصل ہوا۔ اس قیادت نے ان وسائل کو اقتصادی اور سفارتی مقاصد کے لیے بھرپور طریقے سے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ تاہم، اپریل 1920ء میں جب بالشویک کمیونسٹ افواج نے باکو پر حملے کی دھمکی دی، تو یہ قیادت اپنی مختصر خود مختاری اور حاصل شدہ وسائل چھوڑ کر واپس جلاوطنی میں چلی گئی، جو حدیث میں دجال کے ظاہر ہونے کی خبر[59] سن کر واپس پلٹنے کی تعبیر ہے۔

دجال سے پہلے عرب، فارس اور روم پر فتح

دجال سے پہلے تاریخی واقعات کو ایک اور حدیث میں اکٹھا بیان کر دیا گیا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے عرب، پھر فارس، پھر روم، اور آخر میں دجال پر فتح کی پیش گوئی فرمائی۔[60]

یہ تاریخی واقعات سے مطابقت رکھتی ہے: مسلمانوں کے ہاتھوں عرب کی مکمل فتح 633ء میں، فارس کی فتح 651ء میں، بازنطینی (رومی) سلطنت کا خاتمہ 1453ء میں، اور افغانستان میں سوویت افواج کی شکست، جس کے بعد 1991ء میں سوویت یونین کا انہدام ہوا۔

پیشانی پر "کافر" کا نشان — سوویت یونین کا الحاد اور مذہب دشمنی کا اعلانیہ اظہار

جیسے کتابِ مکاشفہ میں "سمندر کے جانور" — جو رومی سلطنت کی علامت تھا — کے سروں پر گستاخانہ الفاظ تحریر تھے،[61] ویسے ہی دجال کے ماتھے پر "کافر" لکھا ہوگا،[62] جسے ہر مسلمان، خواہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ، باآسانی پہچان سکے گا۔[63]

پیشانی انسانی جسم کا سب سے نمایاں حصہ ہے، جو کھلی اور ناقابلِ انکار شناخت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ دجال کی پیشانی پر "کافر" لکھا ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس کی پہچان اور کفر پوشیدہ نہیں بلکہ اعلانیہ ہوگا۔ اسی طرح، سوویت یونین نے بھی مذہب سے انکار کو چھپایا نہیں، بلکہ اسے ایک نظریاتی فخر کے طور پر اپنایا۔ سوویت یونین انسانی تاریخ میں واحد ریاست کے طور پر سامنے آتی ہے جس کی سرکاری نظریاتی پالیسی نے تمام موجودہ مذاہب کے خاتمے، مستقبل میں مذہبی عقائد کے فروغ کی روک تھام، اور طویل المدتی مقصد کے طور پر ریاستی الحاد کے قیام کی باقاعدہ کوشش کی۔[64، 65] ریاستی سطح پر سائنسی دہریت کو فروغ دیا گیا، اور مذہب کو ایک پسماندہ، غیر سائنسی عقیدہ قرار دے کر اس کے مکمل خاتمے کو ایک سرکاری ہدف بنایا گیا۔ اس نظریے کا عملی مظاہرہ نہ صرف مذہبی اداروں کی بندش، بلکہ خاص طور پر ابراہیمی مذاہب کے ماننے والوں پر ریاستی جبر اور دباؤ کی صورت میں بھی ہوا۔

کوئی ہمیں نجات نہیں دے گا

نہ خدا، نہ زار، نہ کوئی ہیرو

ہم اپنی آزادی جیتیں گے

اپنے ہی ہاتھوں سے

(انٹرنیشنل کے اشعار (جو 1922 سے 1944 تک سابقہ سوویت یونین کے قومی ترانے کا حصہ تھے)، جو کمیونزم کے الحادی اور مذہب مخالف نظریے کی عکاسی کرتے ہیں۔)

دجال کی ایک آنکھ اور گھنگریالے بال ہونا—سوویت نظام کی عملی و نظریاتی خامیاں

حدیث میں دجال کا ایک آنکھ سے اندھا ہونا کمیونزم کے محدود نقطہ نظر کی علامت ہے، جو صرف ایک بے طبقہ اور بے ریاست معاشرے کے تصور پر مرکوز ہے۔[66] یہ نظریہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ انسانی باہمی انحصار کو نظر انداز کرتا ہے، جس کے نتیجے میں کمیونزم کی ناکامیاں اور اس کے نفاذ کے دوران ہونے والے تباہ کن نقصانات نمایاں ہوئے۔ اسی طرح، دجال کے گھنگریالے بال اس کے بدصورت اور بے ڈھنگے پن کی نشانی ہیں، جو بند اور کنٹرول شدہ معاشروں، طاقت کے ذریعے مسلط کردہ مساوات، آزادی اظہار کی عدم موجودگی، اور سماجی و سیاسی جبر کی شکل میں سامنے آئیں۔ یوں، دجال کا یہ ظاہری بگاڑ کمیونزم کے نظریاتی اور عملی تضادات کی علامت بن جاتا ہے، جو ایک مثالی سماج کے بجائے ظلم، دباؤ، اور استبداد کی راہ ہموار کرتا ہے۔

دجال بطور جھوٹا مسیح—سوویت نظام کی طرف سے انسانیت کے مسائل کے حل کا دعویٰ

کمیونزم نے مساوات اور انصاف کا جھوٹا وعدہ کیا، لیکن عملاً ایک سخت گیر، جابرانہ اور غیر انسانی نظام قائم کیا۔ یہ نظام دجال کے "جھوٹے مسیح" ہونے کی علامتوں سے مماثلت رکھتا ہے—ایسا مسیحا جو انسانوں کو نجات کا جھوٹا خواب دکھاتا ہے، مگر انہیں ایک نئے ظلم میں مبتلا کر دیتا ہے۔ سوویت ریاست نے غربت، طبقاتی ناانصافی، اور سرمایہ داری کے خلاف حقیقی عوامی جذبات کو استعمال کرتے ہوئے سوشلسٹ جنت کا فریب پھیلایا۔ اس فریب کے نتیجے میں پرتشدد انقلابات، جبری اجتماعی زراعت، طبقاتی تطہیر، اور مذہب و آزادی اظہار پر بے مثال پابندیاں مسلط کی گئیں۔ سوویت پالیسیوں کا مجموعی اثر یہ تھا کہ انسان کو خدا سے کاٹ کر ریاست کی اطاعت پر مجبور کیا گیا، جو دجالی فتنہ کی عملی شکل تھی۔

دجال کی جنت اور دوزخ—سوویت نظام کے وعدوں اور حقیقت میں تضاد

حدیث میں بیان ہوا ہے کہ دجال جنت کی طرف وہ بلائے گا، درحقیقت جہنم ہوگی؛ اور دجال کی آگ یا جہنم ٹھنڈی اور میٹھے پانی کی مانند ہوگی، اس لیے انسان کو وہی چننا چاہیے۔[67]

کمیونسٹ نظام نے بھی زمین پر جنت، برابری اور انصاف کا وعدہ کیا تھا۔ مگر عملی طور پر یہ وعدہ ایک خوفناک دھوکہ ثابت ہوا۔ سرمایہ داری کو استحصال کی علامت بنا کر پیش کیا گیا، لیکن خود کمیونسٹ ریاستیں جبر، قحط اور ظلم کی بدترین مثال بن گئیں۔ سوویت یونین میں جبری مزدوری، گولاگ کیمپوں، اور سیاسی تطہیر کے نتیجے میں لاکھوں انسان لقمۂ اجل بنے۔ چین میں "آگے کی جانب ایک عظیم چھلانگ" کے دوران 1958 سے 1962 تک، ریاستی پالیسیوں کے باعث اندازاً ڈیڑھ سے ساڑھے پانچ کروڑ افراد بھوک اور افلاس کا شکار ہو کر ہلاک ہوئے۔

اس کے برعکس، اسی دور میں سرمایہ دارانہ معاشروں نے معاشی ترقی، سائنسی ایجادات، اور فرد کی آزادی میں نمایاں پیش رفت کی۔ یہ تضاد اس حدیث کی علامتی سچائی کو واضح کرتا ہے—دجال کی پیش کردہ جنت دراصل تباہی کا راستہ تھی،

جب کہ اس کے مخالف سمت میں نجات کی حقیقی راہیں پوشیدہ تھیں۔

دجال بطور جھوٹا نبی—سوویت نظام کی طرف سے انسانیت کی رہنمائی کا دعویٰ

دجال کو جھوٹا نبی [68] کہا گیا ہے کیونکہ وہ جھوٹے طور پر اقتدار، اخلاقی برتری، اور انسانیت کی رہنمائی کا دعویٰ کرتا ہے۔ ایک حقیقی نبی جو الٰہی ہدایت فراہم کرتا ہے، کے برعکس، دجال شیطان کا نمائندہ ہے—بالکل کتاب مکاشفہ کے "جھوٹے نبی" کی مانند، جو شیطان کی آواز میں بولتا ہے۔ [69] سوویت نظام نے دہریت کو ریاستی پالیسی کا درجہ دیا، اور مذہب کو 'عوام کے لیے افیون' قرار دے کر سرکاری طور پر مساجد، گرجا گھروں، اور مذہبی اداروں کو بند کرایا۔ اس نظام نے الحاد اور مادہ پرستی کو فروغ دیا، جو خدا کے انکار اور اخلاقی اقدار کی بے توقیری پر مبنی تھا۔

دجال کا دورانیہ (1917ء–1991ء)

احادیث کے مطابق، دجال کا دورانیہ 40 دن ہوگا، ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا، ایک دن ایک مہینے کے برابر، اور ایک دن ایک ہفتہ کے برابر ہوگا اور بقیہ دن عام دنوں کی طرح۔ [70]

بالکل اسی طرح جیسے کتاب دانیال [71] اور کتاب مکاشفہ [72] میں پیشگوئیوں میں ریاضی کی پہیلیاں پیش کی گئی ہیں، یہ بھی ایک ریاضی کی پہیلی ہے۔ اس پہیلی میں "دن" ادوار کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اگر الٹا پڑھا جائے تو پہلا دور ایک ہفتہ، یعنی 7 دن کا، دوسرا دور ایک مہینہ، یعنی 30 دن کا، اور باقی 38 (کل 40 دنوں میں سے) عام دنوں کی طرح، یعنی یہ 38 ادوار کی نمائندگی نہیں کرتے۔ "ایک دن ایک سال کے برابر ہوگا" کا مطلب یہ ہے کہ ہر دن حقیقی وقت میں ایک سال کے مساوی ہے۔

یہ ادوار—7 سال، 30 سال، اور 38 سال—دجال کے اثرات کے مختلف مراحل کی نمائندگی کرتے ہیں:

- پہلا دور – 7 سال (انقلابی ابتداء–لینن کا دور): 1917 کے فروری انقلاب کے بعد، لینن کی روس واپسی جمادی الثانی 1335 ہجری [73] میں ہوئی، جس کے بعد کمیونسٹوں میں سے بالشویک گروہ ایک طاقت کے طور پر اٹھا اور اسی سال انقلاب برپا کیا۔ لینن کی یہ واپسی اس کی وفات، جو جمادی الثانی 1342 ہجری [74] میں واقع ہوئی، سے ٹھیک سات سال قبل ہوئی، جو ایک ہفتے کے دورانیے کی علامتی نمائندگی کرتی ہے۔ لینن کے دور میں انقلابی تحریکوں نے زور پکڑا اور سوویت ریاست کی بنیاد رکھی گئی۔
- دوسرا دور – 30 سال (طاقت کا عروج–اسٹالن کا دور): اسی طرح، جمادی الثانی 1372 ہجری [75] میں اسٹالن کی موت واقع ہوئی، جو لینن کی وفات کے ٹھیک 30 اسلامی سال بعد کا واقعہ ہے، اور یہ مہینے کے دورانیے کی علامتی نمائندگی کرتی ہے۔ اسٹالن کے دور میں اقتدار کو مضبوط کیا گیا، سوویت یونین کو تیزی سے صنعتی ترقی کی راہ پر گامزن کیا گیا، اور ساتھ ہی عوام پر سخت جبر اور خوف کا نظام نافذ کیا گیا۔ اسٹالن کی حکمرانی میں سوویت ریاست

نے ایک عالمی طاقت کا درجہ حاصل کیا۔

- تیسرا دور- 38 سال (زوال کا آغاز اور انجام): اس کے بعد کے ادوار میں سوویت یونین کی قیادت اور کمیونسٹ تحریک کی شدت میں وہ نمایاں پہلو نظر نہیں آیا جو لینن اور اسٹالن کے عہد میں تھا۔ اسٹالن کی موت کے بعد کمیونزم نے بلاشبہ دنیا بھر میں پھیلاؤ حاصل کیا، اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں انقلابات اور حکومتوں پر گہرے اثرات ڈالے۔ مگر اندرونی ناکامیاں، اقتصادی مسائل، قوم پرستی کی تحریکیں، اور سرد جنگ کے بین الاقوامی دباؤ نے سوویت یونین اور کمیونسٹ بلاک کو بتدریج کمزور کر دیا۔ بالآخر، اسٹالن کی موت کے ٹھیک 38 اسلامی سال بعد، جمادی الثانی 1410 ہجری[76] میں دیوارِ برلن کے گرنے کے ساتھ ہی کمیونسٹ پارٹی کی اجارہ داری کو ختم کر دیا گیا۔ یہ واقعہ دنیا بھر میں کمیونزم کے زوال کی علامت بن گیا، جس کے بعد سوویت یونین کے ٹوٹنے اور عالمی سطح پر کمیونسٹ تحریک کے کمزور پڑ جانے کا عمل تیزی سے اسٹالن کی موت کے ٹھیک 40 اسلامی سال بعد، جمادی الثانی 1412 ہجری[77] میں مکمل ہوا۔

دجال کی تعداد–30 کمیونسٹ ریاستیں

حدیث کے مطابق، تقریباً تیس دجال ہوں گے، جو نبی ہونے کا دعویٰ کریں گے۔[78]

یہ تعداد تقریباً دنیا میں ماضی کی تیس کمیونسٹ ممالک سے مطابقت رکھتی ہے۔ جھوٹے نبیوں کی طرح، کمیونسٹ حکومتوں نے خود کو مطلق سچائی کا علمبردار بنا کر پیش کیا، اپنے نظریے کو انسانیت کے لیے واحد روشنی قرار دیا، اور طاقت کے ذریعے اطاعت مسلط کی۔

اس تناظر میں سوویت یونین کو مرکزی دجال سمجھا گیا ہے۔ کچھ کمیونسٹ ریاستیں مختصر مدت کے لیے قائم رہیں اور بعد میں سابق سوویت یونین میں ضم ہو گئیں، جبکہ بعض میں مخلوط نظام پایا جاتا تھا، جس کی وجہ سے حدیث میں "تقریباً" کا ذکر کیا گیا۔ ان ریاستوں میں سے تمام یا تو تحلیل ہو چکی ہیں یا اصلاحات کے ذریعے اپنے نظریات بدل چکی ہیں۔[79]

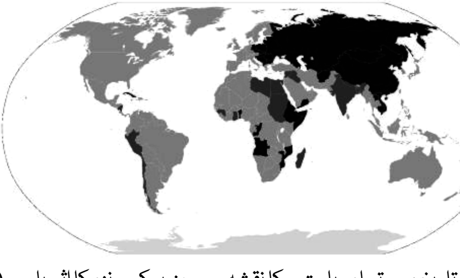

شکل 2: یہ تاریخ میں تمام ریاستوں کا نقشہ ہے جن پر کمیونزم کا اثر رہا ہے ('سرخ' رنگ میں دکھائے گئے ممالک وہ ہیں جو یک جماعتی نظام کے ساتھ رسمی کمیونسٹ ریاستیں تھیں؛ دیگر رنگ ان ممالک کی نمائندگی کرتے ہیں جہاں اثر موجود تھا لیکن کثیر الجماعتی نظام قائم رہا)۔ یہ نقشہ دنیا بھر میں کمیونزم کی پہنچ کو ظاہر کرتا ہے۔[80]

دجال کا دنیا کا سفر

حدیث [81] میں دجال کے دنیا کے سفر کو ہوا سے اُڑائی گئی بارش سے تشبیہ دی گئی ہے، جو اس کی تیز رفتاری اور عالمی اثرات کی علامت ہے۔ اسی طرح کمیونزم بھی دنیا کے ہر براعظم میں پھیلا، مگر آخر کار بارش کی طرح تھم کر ختم ہو گیا۔

دجال کی آزمائش سے بڑی کوئی آزمائش نہیں ہو گی

حدیث [82] میں دجال کی آزمائش کو سب سے بڑی آزمائش کہا گیا ہے۔ اپنے عروج کے وقت دنیا کی ایک تہائی سے زیادہ آبادی کمیونسٹ حکومتوں کے زیر اثر تھی۔ [83] یہ انسانی تاریخ میں مذہبی جبر اور آزادیوں کی خلاف ورزی کے وسیع ترین واقعات میں سے ایک تھا، جس نے اربوں افراد کو متاثر کیا۔

مسلمان دجال کی آزمائشوں سے بچنے کے لیے پہاڑوں میں پناہ لیں گے

احادیث [84، 85] ایک ایسے وقت کا ذکر کرتی ہے جب مسلمان شدید فتنوں، بشمول دجال کے ظہور، کے دوران اپنے دین کی حفاظت کے لیے پہاڑوں اور وادیوں جیسے دور دراز مقامات کی طرف ہجرت کریں گے۔ تاریخی طور پر، ایسے افراد جنہوں نے اپنے مذہبی عقائد کو محفوظ رکھنے کے لیے پناہ لی، ان میں ابا کان کے پہاڑوں جیسے علاقوں کے لوگ شامل ہیں [86]۔

دجال سے حفاظت کے لیے سورہ کہف کی تلاوت

احادیث [87] میں سورہ کہف کی تلاوت کی خاص تاکید کی گئی ہے، جو دجال کے فتنے جیسے عظیم امتحانات کے دوران مؤمنوں کے ایمان، عزم اور بصیرت کو تقویت بخشتی ہے۔ یہ ہدایت اس واقعے سے مماثلت رکھتی ہے جو "اصحابِ کہف" کے بارے میں بیان ہوا — جنہوں نے مذہبی جبر اور آزمائش کے دور میں حق پر قائم رہنے کے لیے ہجرت کی اور اللہ کی پناہ میں جا بسے۔

دجال کے واقعات

مندرجہ ذیل واقعات حدیث میں تاریخی ترتیب سے بیان ہوئے ہیں:

دجال کے ستر ہزار اصفہان کے یہودی پیروکار — ولنا کے یہودیوں میں سوشلسٹ رجحانات (بیسویں صدی کے اوائل میں)

رسول اللہ ﷺ کی پیش گوئی کے مطابق دجال کے پیروکاروں میں اصفہان کے ستر ہزار یہودی شامل ہوں گے جنہوں نے چادریں (طیالسہ) لی ہوں گے۔[88]

اصفہان رسول اللہ ﷺ کے دور میں یہودیوں کا ایک معروف علمی و مذہبی مرکز تھا، جہاں کی یہودی برادری تلمودی علم، فقہی بصیرت اور مذہبی قیادت کے حوالے سے خاصی بااثر سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ بیسویں صدی کے آغاز میں اصفہان میں یہودی کمیونٹی موجود تھی، لیکن وہ علمی و فکری لحاظ سے اس حیثیت کی حامل نہ تھی جس کے لیے وہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں معروف تھی۔ اسی طرح کی ایک فکری روایت ہمیں بیسویں صدی کے اوائل میں ولنا (ولنیئس) میں بھی نظر آتی ہے، جسے "شمال کا یروشلم" کہا جاتا تھا۔ یہاں کی یہودی برادری مدارس، کتب خانوں، اور فکری مجالس کے مضبوط نظام کے ذریعے علم و ثقافت کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ساتویں صدی کے اصفہان کے یہودی اور بیسویں صدی کے اوائل میں ولنا کے یہودی، اگرچہ مختلف ادوار اور ماحول سے تعلق رکھتے تھے، مگر ایک ملتی جلتی روایت — یعنی علم و دانش، مذہبی قیادت اور فکری سرگرمی — میں شریک نظر آتے ہیں۔ ان دونوں ادوار و مقامات میں مذہبی اور ثقافتی شناخت کے اظہار کا ایک خاص اسلوب تھا — اصفہان میں چادر کی صورت میں، تو ولنا میں یدیش زبان و ادب کی روایت کے طور پر۔ حدیث میں مذکور "چادر" ایسی ہی روایات کا علامتی حوالہ ہے، جو ان کی تہذیبی و دینی وابستگی کی نمائندگی کرتی ہے۔

حدیث میں مذکور "ستر ہزار" کا عدد ولنا میں بیسویں صدی کے آغاز میں موجود یہودی آبادی کی طرف اشارہ ہے، جو 1897ء میں 63,000 تھی اور 1901ء میں بڑھ کر 76,000 ہو گئی۔ اسی دور میں ولنا کی یہودی برادری انقلابی تحریکوں، بالخصوص سوشلسٹ اور مارکسی نظریات میں بھرپور طور پر متحرک تھی۔ خاص طور پر 1897ء میں "جنرل یہودی مزدور پارٹی" کا ولنا میں قیام اور 1905ء کے ناکام روسی انقلاب میں ان کی شرکت قابلِ ذکر ہے، جہاں ولنا کے یہودیوں نے واضح طور پر ایک سوشلسٹ ایجنڈے کے تحت انقلابی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔[89]

مشرق کی سمت سے آنا اور شام اور عراق کے درمیان ظاہر ہونا — سوویت یونین کا مغرب کے مقابل نئی عالمی طاقت کے طور پر ظہور (1922ء)

رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں شام اور عراق کے درمیان کا خطہ بازنطینی اور ساسانی سلطنتوں کے درمیان ایک متنازعہ سرحدی علاقہ تھا، جہاں کسی ایک طاقت کو مستقل اور بلا مزاحمت غلبہ حاصل نہ تھا۔ احادیث[90] میں دجال کے اسی علاقے میں ظاہر ہونے کا ذکر، دو اہم علامتی مفاہیم رکھتا ہے: اول، یہ کہ دجال کسی موجودہ طاقت کا تسلسل نہیں ہوگا بلکہ ایک نئی اور خود مختار قوت کے طور پر اُبھرے گا؛ دوم، یہ کہ اس کا ظہور مدینہ کے مشرق کی جانب سے ہوگا۔

تاریخی طور پر، سوویت یونین کا بیشتر حصہ مدینہ کے مشرق میں واقع تھا، اور جب یہ 1922ء میں وجود میں آیا، تو دنیا بھر میں اسے مشرق سے اُبھرنے والی ایک نئی طاقت کے طور پر دیکھا گیا — نہ صرف جغرافیائی لحاظ سے بلکہ نظریاتی اعتبار

سے بھی۔ کمیونزم، سرمایہ دارانہ مغربی دنیا کے مقابل ایک انقلابی نظام کے طور پر پیش کیا گیا، جس نے مذہب، معاشرت اور سیاست میں ایک نئی جہت متعارف کروائی۔ اس لحاظ سے، دجال کے مشرق سے ظہور کی علامت اور سوویت یونین کا قیام ایک گہری معنوی مماثلت رکھتے ہیں۔

دجال کا رزق دینا اور لوگوں کا ایمان لانا – سوویت یونین کی مصنوعی خوشحالی اور پروپیگنڈا (1928ء–1932ء)

حدیث [91] کے مطابق، دجال لوگوں کو بلائے گا، اور وہ اس پر ایمان لے آئیں گے۔ دجال حکم دے گا، آسمان بارش برسائے گا، اور زمین فصلیں اگائے گی اور جانور دودھ سے بھرے ہوں گے۔

یہ منظر سوویت یونین کے ابتدائی دور، خاص طور پر پہلے پانچ سالہ منصوبے (1928–1932) [92] کے دوران، علامتی طور پر دجال کے فریب کی عکاسی کرتا ہے—لوگوں نے اس نظام کو مذہبی عقیدے جیسی یقین دہانی کے ساتھ قبول کیا، اور ریاست نے بظاہر معجزاتی نتائج دیے: گونجتے کارخانے، بھرپور فصلیں، اور خوشحالی کا ایک مصنوعی تاثر۔ "اسٹاخانوف تحریک" [93] جیسے اقدامات میں مزدوروں کو ناقابلِ یقین اہداف سے بھی آگے بڑھتے ہوئے دکھایا گیا، جس سے یہ تاثر مضبوط ہوا کہ کمیونزم فطرت کو قابو میں لا سکتا ہے اور لامحدود ترقی لا سکتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے دجال بارش اور مال و دولت لا کر لوگوں کو متاثر کرے گا۔

لوگوں کا دجال کی دعوت کو رد کرنا، اور دجال کا ان کو قحط اور مفلسی میں مبتلا کرنا – ہولودومور قحط (1932ء–1933ء)

حدیث [94] کے مطابق، دجال ان لوگوں کے پاس جائے گا جو اس کی دعوت کو رد کریں گے، اور وہ قحط، بھوک اور مال و دولت کے نقصان کا شکار ہوں گے، یہاں تک کہ ان کے پاس کوئی مال و دولت باقی نہیں رہے گا۔

یہ منظر یوکرین کے کسانوں سے مشابہت رکھتا ہے جنہوں نے کمیونسٹ اجتماعی زراعت کی مخالفت کی۔ ریاست نے خوراک ضبط کر لی، رسد بند کر دی، اور مزاحمت کو کچل دیا، جس کے نتیجے میں ہولودومور (1932–1933) جیسا انسان ساختہ قحط پیدا ہوا۔ قدرتی قحط نہ ہونے کے باوجود، پالیسیوں نے کھیتوں کو ویران، مویشیوں کو ہلاک، اور عوام کو بھوک کا شکار کر دیا۔ جیسے دجال انکار کرنے والوں کو تباہی میں چھوڑ دیتا ہے، ویسے ہی ریاست نے ان لوگوں کو مکمل بربادی میں چھوڑ دیا، جس کے نتیجے میں پینتیس سے پچاس لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ [95]

دجال کا ویران زمین سے خزانے کو نکالنا — سوویت یونین کا دور دراز علاقوں سے معدنیات کو نکالنا (1933ء کے بعد)

حدیث[96] کے مطابق، دجال ایک ویران زمین سے گزرے گا اور کہے گا: "اپنے خزانے نکالو"، تو زمین کے خزانے نکل کر مکھیوں کے جھرمٹ کی طرح اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

یہ منظر اس دور سے مشابہ ہے جب سوویت یونین نے نظریاتی گرفت مضبوط کرنے کے بعد سائبیریا، وسطی ایشیا اور یورال جیسے دور افتادہ اور ویران علاقوں کا رخ کیا، اور وہاں سے قدرتی وسائل نکالنے کا وسیع عمل شروع ہوا۔ خصوصاً دوسرے پانچ سالہ منصوبے (1933–1937) کے دوران، سونا، کوئلہ، تیل اور دیگر معدنیات جبری مشقت اور ریاستی صنعت کاری کے ذریعے حاصل کی گئیں، اور ان قیمتی وسائل کو یوں مرکز میں جمع کیا گیا جیسے دجال کے ایک حکم پر خزانے زمین سے نکل کر اس کے گرد سمٹ آئے ہوں۔ یہ عمل صرف ایک منصوبے تک محدود نہ رہا، بلکہ بعد کے سالوں میں بھی سوویت معیشت کا مرکز و محور یہی وسائل رہے۔

دجال کا مدینہ کے باہر قیام — مسلم دنیا میں سوویت اثر و رسوخ کی ناکامیاں (بیسویں صدی کا دوسرا حصہ)

حدیث میں ذکر ہے کہ دجال مدینہ کے قریب قیام کرے گا لیکن مدینہ میں داخل نہیں ہو سکے گا، کیونکہ فرشتے اس کی حفاظت کریں گے۔ پھر فرشتے اس کا رخ شام کی طرف موڑ دیں گے اور وہیں وہ ہلاک ہو جائے گا[97]۔

"مدینہ" یہاں صرف ایک شہر نہیں بلکہ پوری مسلم امت کی نمائندگی کرتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں مدینہ مسلمانوں کی ریاست کا مرکز تھا۔ دوسری جانب، شام اس وقت بازنطینی عیسائیوں کا علاقہ تھا، جو عیسائی دنیا کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ اس حدیث کو علامتی طور پر سوویت یونین کے مسلم دنیا میں اپنے قدم جمانے میں ناکامی کے بعد اپنے اختتام سے پہلے عیسائی دنیا کی طرف رخ کرنے کے طور پر تعبیر کیا گیا ہے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد سوویت یونین ایک عالمی طاقت کے طور پر اُبھر کر سامنے آیا اور دنیا بھر میں اپنے اثر و رسوخ کو پھیلایا، جس میں مسلمانوں کو سوویت بلاک میں شامل کرنے اور کمیونزم اختیار کرنے کی کوششیں بھی شامل تھیں۔ تاہم، سوویت حکومت کا دہریہ نظریہ مسلم دنیا کے قدامت پسند اور گہرے مذہبی ماحول سے شدید طور پر متصادم تھا۔ یہی نظریاتی اختلاف مسلمانوں کی دنیا میں کمیونزم کی قبولیت اور اثر و رسوخ کو محدود رکھنے کا باعث بنا۔ ——اور یوں، دجال مدینہ میں داخل نہ ہو سکا۔

مدینہ میں تین جھٹکے — امتِ مسلمہ کو درپیش عالمی سیاسی وفکری بحران

حدیث[98] کے مطابق مدینہ تین بار لرزے گا، جس کے بعد ہر منافق اور کافر مدینہ سے باہر نکل کر دجال کی طرف چلا جائے گا۔ اس کی تشریح غالباً درج ذیل میں بیان تین تاریخی واقعات ہیں:

1948 میں اسرائیل کا قیام اور نکبہ — 1948 میں اسرائیل کے قیام کے بعد لاکھوں فلسطینی بے دخل کر دیے گئے، جسے نکبہ (یعنی تباہی) کہا جاتا ہے۔ سینکڑوں دیہات تباہ ہوئے اور فلسطینی پناہ گزین بن گئے۔ مسلم دنیا نے اسے مغربی طاقتوں کی پشت پناہی سے ہونے والا بڑا ظلم سمجھا۔ اس سانحے نے عرب معاشروں کو ہلا کر رکھ دیا اور کئی نوجوانوں اور دانشوروں کو کمیونسٹ تحریکوں کی طرف راغب کیا، تاکہ مزاحمت کی راہ اپنائی جا سکے۔

1956 کا سویز بحران — جب 1956 میں برطانیہ، فرانس اور اسرائیل نے سویز نہر پر حملہ کیا، تو مصر نے اس جارحیت کے خلاف سوویت یونین سے سفارتی اور سیاسی مدد حاصل کی۔ یہ پہلا بڑا موقع تھا جب کسی عرب ریاست نے کھلے عام سوویت طاقت پر انحصار کیا۔ اس واقعے نے مشرقِ وسطیٰ میں بائیں بازو کے نظریات کو فروغ دیا، جس کے نتیجے میں عراق اور شام میں بعث پارٹی جیسے قوم پرست اور سوشلسٹ گروہ اقتدار میں آئے، جبکہ جنوبی یمن میں ایک باقاعدہ کمیونسٹ ریاست قائم ہوئی۔

1967 کی چھ روزہ جنگ — 1967 کی چھ روزہ جنگ میں اسرائیل کی فتح نے عرب قوم پرستی کو شدید دھچکا پہنچایا، جس کے نتیجے میں بائیں بازو کے نظریات کی ایک نئی لہر اُٹھی۔ اس کے اثرات سے فلسطینی مزاحمتی تحریکوں میں مارکسی دھڑوں کا ظہور ہوا، جن میں پی ایل ایف پی (پاپولر فرنٹ فار دی لبریشن آف فلسطین) نمایاں تھا، جس نے کھلے عام سوویت حمایت یافتہ انقلابی راستے کو اپنایا۔

بنی تمیم کی دجال کے خلاف مزاحمت — آلِ شیخ اور کمیونزم

رسول اللہ ﷺ نے بنی تمیم قبیلے کے دجال کے خلاف ثابت قدم رہنے کی پیشگوئی فرمائی۔[99] یہ قبیلہ، جو تاریخی طور پر سعودی عرب، عراق اور خلیجی ریاستوں میں آباد ہے، بعد ازاں کمیونزم کے خلاف فکری و سماجی مزاحمت کی علامت بن کر سامنے آیا۔ بنی تمیم نے اسلامی روایات، عقائد اور قبائلی اقدار کو فروغ دے کر کمیونزم کے مادّی اور لادینی نظریات کو رد کیا۔ اس پیشگوئی کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ آلِ شیخ — جو شیخ محمد بن عبد الوہاب کی نسل سے ہیں — اسی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔[100] سعودی عرب میں آلِ شیخ کے فکری اثر کے تحت کمیونزم کو نہ صرف لادین بلکہ اسلام کے صریح مخالف تصور کیا گیا۔ یہی وجہ تھی کہ سوویت یونین سے کسی بھی قسم کا اتحاد عقیدے کے منافی اور ناقابل قبول سمجھا گیا۔

دجال کا ایک مسلمان کو قتل اور زندہ کرنا اور دوبارہ قتل نہ کر پانا — سوویت یونین اور افغانستان (1977ء–1992ء)

حدیث[101] میں بیان ہوا ہے کہ ایک مسلمان جو مدینہ سے نکلے گا، اسے دجال کے پاس لے جایا جائے گا، جہاں دجال اسے قتل کرے گا اور دوبارہ زندہ کرے گا، لیکن دجال اس شخص کو دوبارہ قتل کرنے پر قادر نہیں ہوگا۔ ایک اور حدیث[102] اس واقعے کی تفصیلات کو بیان کرتی ہے کہ دجال ظاہر ہوگا اور ایک مومن اس کا سامنا کرے گا۔ دجال کے فوجی اسے روک کر اس کی نیت کے بارے میں سوال کریں گے۔ جب وہ دجال کو اپنا رب ماننے سے انکار کرے گا، تو وہ کہیں گے: "اسے قتل کر دو۔" مگر ان میں سے کچھ کہیں گے: "کیا تمہارے آقا (دجال) نے بغیر اس کی اجازت کے کسی کو قتل کرنے سے منع نہیں کیا؟" پھر وہ اسے دجال کے پاس لے جائیں گے۔ مومن اسے پہچان کر پکار اٹھے گا: "یہی دجال ہے!" دجال اس کے قتل کا حکم دے گا، اور اسے آرے سے چیر کر دو ٹکڑے کر دیا جائے گا، پھر دجال اسے زندہ کر دے گا۔ لیکن مومن دوبارہ دجال کو جھٹلائے گا اور اس کے فریب کو ظاہر کرے گا۔ دجال جب اسے دوبارہ قتل نہ کر سکے گا، تو اسے اٹھا کر پھینک دے گا، ایسا محسوس ہوگا جیسے وہ جہنم میں جا رہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔ نبی کریم (ﷺ) نے فرمایا کہ وہ اللہ کے نزدیک سب سے عظیم شہید ہوگا۔

یہاں "مدینہ" صرف ایک شہر نہیں، بلکہ پوری مسلم امت کی نمائندگی کرتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے دور میں مدینہ مسلمانوں کی ریاست کا مرکز تھا۔ "مومن" افغانستان کی علامت ہے، جبکہ "دجال" سوویت یونین کی، اور دجال کے فوجی افغانستان میں موجود کمیونسٹ دھڑوں (پرچم اور خلق) کی نمائندگی کرتے ہیں۔ "قتل اور زندہ کرنا" کمیونسٹ انقلابات کی علامت ہے، جنہوں نے پرانے حکومتی اور سماجی ڈھانچوں کو ختم کر کے نئے نظام قائم کیے۔ "زندہ کرنا" ایک نئے کمیونسٹ نظام کے تحت سماجی تنظیم نو کی طرف اشارہ کرتا ہے، جو اکثر انسانی مصائب کی بھاری قیمت پر مکمل ہوا۔ یہ حدیث افغانستان میں کمیونسٹ دھڑوں کے اقتدار، سوویت مداخلت، اور اس کے خلاف مزاحمت کی ایک علامتی تعبیر کے طور پر سمجھی جا سکتی ہے:

۱. مومن کا دجال کو رب نہ ماننا – 1977 میں کمیونسٹ دھڑے کی بے دخلی: 1970 کی دہائی میں، افغان حکومت میں کمیونسٹ جماعت کا دھڑا "پرچم" شامل تھا۔ تاہم، 1977 میں صدر محمد داؤد خان نے کمیونسٹوں کی بغاوت کی منصوبہ بندی کا پتہ لگا کر انہیں حکومت سے بے دخل کر دیا۔ یہ واقعہ حدیث میں دجال کے محافظوں کا سوال کرنا اور مومن کے دجال کو اپنا رب ماننے سے انکار کے مترادف ہے۔

۲. دجال کے فوجی کا مومن کو قتل کرنے کی کوشش کرنا – 1978 میں خلق کا انقلاب اور ظلم و جبر: 1978 میں ثور انقلاب کے ذریعے خلق دھڑے نے زبردستی اقتدار پر قبضہ کر لیا، جس میں صدر داؤد خان کو قتل کر دیا گیا۔ یہ

حدیث میں دجال کے فوجی کے مومن کو قتل کرنے کی کوشش کی تعبیر ہے- یہ سوویت یونین کے لیے بھی حیران کن تھا، کیونکہ وہ غیر متوقع انقلابات سے عدم استحکام سے بچنا چاہتا تھا۔ سوویت یونین کی یہ پالیسی حدیث کی اس بات سے مطابقت رکھتی ہے کہ "کیا تمہارے آقا (دجال) نے بغیر اس کی اجازت کے کسی کو قتل کرنے سے منع نہیں کیا"۔

۳. دجال کا مومن کو قتل اور زندہ کرنا- 1979 میں سوویت مداخلت اور خلق کا صفایا: 1979 میں سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کر کے خلق کے حکمران حافظ اللہ امین کو قتل کیا اور پرچم دھڑے کو اقتدار میں بٹھایا۔ یہ تبدیلی آپریشن اسٹورم-333 کے ذریعے ممکن ہوئی، جس میں سوویت فورسز نے خلق قیادت کو قتل کیا، مزاحمت کو کچلا، اور بڑے پیمانے پر قتل وغارت کی۔ یہ حدیث میں مومن کے اوپر تشدد اور قتل اور دوبارہ زندہ ہونے سے مماثلت رکھتا ہے، کیونکہ خلق دھڑے کو تشدد سے ہٹایا گیا اور پرچم دھڑا مسلط کر دیا گیا۔ اگرچہ ماضی میں خلق دھڑا کمیونسٹ نظریات کا حامی تھا، لیکن سوویت یونین کے طرزِ عمل نے اس کے کئی رہنماؤں کو بدظن کر دیا، جس کا خمیازہ انہیں بھاری نقصان کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

دجال کا مومن کو دوبارہ قتل نہ کر پانا- مجاہدین کی مزاحمت اور سوویت ناکامی: سوویت یونین نے افغانستان میں اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش کی، مگر مجاہدین کی مزاحمت بڑھتی ہی چلی گئی۔ حدیث میں مومن کی گردن کا تانبے میں بدل جانا، جس کی وجہ سے اسے دوبارہ قتل کرنا ممکن نہ رہا، سوویت فوجی کارروائیوں کی شدت اور ناکامی کا اشارہ دیتا ہے۔ 1989 میں سوویت فوجوں کا انخلا حدیث میں دجال کے مومن کو دور پھینکنے کے مترادف ہے۔

مومن کی شہادت- 1992 میں کمیونسٹ حکومت کے خاتمے کے بعد شدید خانہ جنگی: 1992 میں کمیونسٹ حکومت کا خاتمہ اور شدید خانہ جنگی حدیث میں مومن کی شہادت کے مترادف ہے۔ اسی طرح، مومن کا جنت میں داخل ہونا ان مجاہدین کی خلوص نیتی کو ظاہر کرتا ہے، جنہوں نے سوویت یونین کے خلاف جنگ کو الحاد اور ظلم کے خلاف جہاد سمجھا۔

تعبیر سے متعلق سوالات

حضرت تمیم داریؓ کا دجال سے ملنا

ایک حدیث[103] کے مطابق حضرت تمیم داریؓ نے نبی کریم ﷺ کو ایک واقعہ سنایا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ سمندر کے سفر پر نکلے اور ایک طوفان کے باعث ایک جزیرے پر جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے ایک عجیب وغریب مخلوق "الجساسہ" دیکھی، جس نے انہیں ایک غار میں لے جا کر ایک آدمی سے ملوایا۔ وہ آدمی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا اور اس نے ان سے کئی سوالات کیے اور پھر اپنے بارے میں بتایا کہ وہ "المسیح الدجال" ہے اور اس کے نکلنے کا وقت قریب ہے۔ جب حضرت تمیم داریؓ نے یہ واقعہ نبی کریم ﷺ کو سنایا تو آپ ﷺ نے لوگوں کے سامنے اس کی تصدیق فرمائی اور فرمایا

کہ "یہ واقعہ میرے اس بیان کے مطابق ہے جو میں تمہیں پہلے دجال کے بارے میں بتاتا رہا ہوں۔"

حضرت تمیم داریؓ کی یہ حدیث ایک رویا معلوم ہوتی ہے، نہ کہ دجال کے ساتھ حقیقی جسمانی ملاقات۔ اس کی تین بنیادی وجوہات ہیں:

- حضرت تمیم داریؓ کے ساتھ سفر کرنے والے دیگر افراد کی طرف سے اس غیر معمولی واقعہ کی کوئی علیحدہ گواہی کی روایت موجود نہیں ہے، جو اس واقعے کے رویا ہونے کے حق میں دلیل ہے۔
- ایک اور حدیث کے مطابق نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ: "میرے زمانے میں موجود تمام لوگ سو سال کے اندر وفات پا جائیں گے۔"[104] اگر دجال اس وقت واقعی جسمانی طور پر موجود ہوتا تو وہ بھی ان میں شامل ہوتا۔
- جس طرح نبی کریم ﷺ نے خود بھی رویا میں دجال کو دیکھا تھا،[105] اسی طرح حضرت تمیم داریؓ کا یہ واقعہ بھی ایک رویا تھا۔

ابن صیّاد کا دجال ہونا

کچھ احادیث[106] میں ابن صیاد، جو مدینہ کے نواح میں رہنے والا ایک لڑکا تھا، کے دجال ہونے کا امکان ظاہر ہوتا ہے، لیکن ایک واضح حدیث[107] میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "اگر دجال میرے ہوتے نکلے تو میں تمہاری طرف سے اس کا مقابلہ کروں گا۔" یہ بات واضح کرتی ہے کہ چونکہ ابن صیاد نبی ﷺ کے زمانے میں موجود تھا، اس لیے وہ دجال نہیں ہو سکتا۔

مزید یہ کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ دجال مکہ اور مدینہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔[108] اس کے برخلاف، تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن صیاد مدینہ سے مکہ کا سفر کر چکا تھا، جو اس بات کا مزید ثبوت ہے کہ وہ دجال نہیں تھا۔
[109]

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ کا دجال کو ایک انسان سمجھنا

احادیث مبارکہ سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرامؓ دجال کو ایک انسان تصور کرتے تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے دجال کو رؤیا میں دیکھا،[110] اور چونکہ انبیاء کے رؤیا وحی کی ایک قسم ہوتے ہیں، وہ ان میں کسی ذاتی تعبیر یا قیاس کو شامل کیے بغیر، جو کچھ دیکھتے ہیں، بعینہٖ اسی طرح بیان فرماتے ہیں۔

انبیاء کے خوابوں کی تعبیر یا تو اللہ تعالیٰ خود اپنے نبی کو عطا فرما دیتا ہے، یا وقت کے ساتھ ساتھ اس کی حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے۔ اس کی ایک واضح مثال حضرت یوسف علیہ السلام کا وہ خواب ہے جو انہوں نے بچپن میں دیکھا تھا — جس میں سورج، چاند اور گیارہ ستارے انہیں سجدہ کر رہے تھے۔ برسوں بعد، جب ان کا خاندان مصر میں ان کے سامنے حاضر ہوا، تو حضرت یوسفؑ نے فرمایا: "اے ابا جان! یہ ہے تعبیر میرے اس خواب کی جو میں نے پہلے دیکھا تھا، میرے رب نے اسے سچ کر دکھایا۔"[111]

اسی اصول پر، نبی کریم ﷺ نے جب دجال کو انسان کی صورت میں رؤیا میں دیکھا،[112] تو اسے اسی طرح بیان فرمایا جیسا کہ دیکھا۔ صحابہ کرامؓ نے بھی اس کو ایک انسان ہی سمجھا، کیونکہ نبی ﷺ نے رویا کی کوئی تعبیر پیش نہیں کی۔ یہ امر اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دجال سے متعلق روایات کی مکمل تفہیم اور ان کی تعبیرات کا علم، ان واقعات کے ظہور کے وقت ہی ممکن ہو گا۔ اس سے قبل، ان کی حقیقی نوعیت محض قیاس یا اجتہاد ہی ہو سکتی ہے۔

حوالہ جات

34) Daniel 7:4: https://www.bible.com/bible/111/dan.7.4.NIV

35) Sahih Muslim 2899a: https://sunnah.com/muslim:2899a

36) اکرم، اے۔ آئی۔، اللہ کی تلوار: خالد بن ولید کی سوانح عمری

37) Sahih Muslim 2897: https://sunnah.com/muslim:2897

38) https://www.britannica.com/place/Amuq

39) https://en.wikipedia.org/wiki/Amik_Valley

40) یاقوت حَمَوی (متوفی 626ھ/1229ء) "معجم البلدان" (لغاتِ بلاد) میں "العمق" یا "العميق" کے عنوان کے تحت العمق: یہ نام مختلف مقامات کے لیے استعمال ہوتا ہے، جن میں قدیم وہ ہے جو انطاکیہ کے قریب واقع ہے۔

41) "تھامس ایسبرج، پہلی صلیبی جنگ: ایک نئی تاریخ (2004)" — یہ نوٹ کرتے ہیں کہ 10 اکتوبر 1097 تک صلیبی لشکر "ماراش پہنچ چکا تھا، جو العُماق کے سرے پر واقع ہے... [یہی] راستہ انطاکیہ کی طرف جاتا تھا"، جس کے بعد وہ العُماق میں نیچے کی طرف بڑھے۔

42) ابن الأثیر، الکامل في التاریخ، جلد 8، المکتبۃ الشاملۃ

43) ابن الأثیر، الکامل في التاریخ، جلد 8، المکتبۃ الشاملۃ

44) ابن الأثیر، الکامل في التاریخ، جلد 8، المکتبۃ الشاملۃ

45) Sahih Muslim 2897: https://sunnah.com/muslim:2897

46) Sahih Muslim 2897: https://sunnah.com/muslim:2897

47) Sahih Muslim 2899a: https://sunnah.com/muslim:2899a

48) مثلاً سول اللہ ﷺ کو "امین" اور "صادق" کہا گیا ہے، اور انہیں سفید گھوڑے پر سوار دکھایا گیا ہے: Revelation 19:11 :https://www.bible.com/bible/111/REV.19.11.NIV

49) یوسف کمال تنگیر شینک — ماسکو معاہدے (1921) میں ترک وفد کے سربراہ، سوویت حمایت حاصل کی۔

رضا نور — ماسکو معاہدہ (1921) اور کارس معاہدہ (1921) کے اہم مذاکرات کار، سوویتوں کے ساتھ سرحدی معاملات طے کیے۔

علی فواد جیبیسوئے — 1921 میں سوویت روس کے پہلے ترک سفیر، باضابطہ سفارتی تعلقات قائم کیے۔

کاظم کارابیکر — مشرقی محاذ پر سوویت یونین کے ساتھ فوجی مذاکرات کے ماہر۔

راوف اوربے — سفارتی مذاکرات کے ذریعے سوویت فوجی اور مالی امداد کے حصول میں شامل۔

بیکر سامی کندوح — انقرہ حکومت کے پہلے وزیر خارجہ، بولشویکوں کے ساتھ ابتدائی سفارتی روابط قائم کیے۔

احمد مختار بے — ماسکو مذاکرات میں نمایاں کردار ادا کیا، رضا نور اور یوسف کمال کے ساتھ۔

خلیل پاشا (خلیل کُت) — غیر رسمی سفیر کے طور پر کام کیا، ہتھیاروں کی فراہمی اور غیر رسمی مذاکرات میں مدد فراہم کی۔

محمود جلال بایار — بولشویکوں کے ساتھ معاشی مذاکرات میں مصروف رہے، تجارت اور مالی تعاون پر توجہ دی۔

مصطفیٰ کمال اتاترک۔اگرچہ براہ راست مذاکرات میں شامل نہیں تھے، مگر سوویتوں کے ساتھ سفارتی حکمت عملی کی رہنمائی میں اہم کردار ادا کیا۔

50) https://en.wikipedia.org/wiki/Treaty_of_Moscow_(1921)

51) Sahih Muslim 2920a: https://sunnah.com/muslim:2920a

52) جیسے یہودی

53) مزید برآں، حدیث میں "بنی اسرائیل" کے بجائے "بنی اسحاق" کی اصطلاح کا استعمال اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہاں "بنی اسحاق" ایک علامتی نسبت کے طور پر بیان کیا گیا ہے نہ کہ محض نسلی یا تاریخی مفہوم میں۔ اگر اس سے مراد یہودی ہوتے تو "بنی اسرائیل" کا واضح استعمال ہوتا، کیونکہ یہودی نہ صرف نبی کریم ﷺ کے زمانے میں موجود تھے بلکہ آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔

54) 1917ء کے قفقازی سالنامے کے مطابق باکو شہر میں 69,366 شیعہ مسلمان آباد تھے:

https://en.wikipedia.org/wiki/Baku_gradonachalstvo

55) https://bakuresearchinstitute.org/en/the-liberation-of-baku-a-retrospective-view-after-a-century

56) Roland P. Minez, At the Limit of Complexity: British Military Operations in North Persia and the Caucasus 1918

57) https://milwaukeearmenians.com/2015/09/11/massacre-of-baku

58) https://axc.preslib.az/en/page/e7tUwdDSIh

59) یہ وہی خبر ہے جسے ایک اور حدیث میں شیطان کی پکار "مسیح تمہارے گھروں میں داخل ہو گیا ہے!" کے ذریعے بیان کیا گیا ہے:

Sahih Muslim 2897: https://sunnah.com/muslim:2897

60) Sahih Muslim 2900: https://sunnah.com/muslim:2900

61) Revelation 13:1–10: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.1-10.NIV

62) Sahih Bukhari 1555: https://sunnah.com/bukhari:1555

63) Sahih Muslim 2934b: https://sunnah.com/muslim:2934b

64) فروز، پال۔ "سوویت روس میں جبری سیکولرائزیشن: ایک دہری اجارہ داری کیوں ناکام ہوئی؟" جرنل برائے سائنسی مطالعۂ دین، جلد 43، شمارہ 1 (مارچ 2004): صفحات 35–50۔ شائع کردہ: وائیلی۔

65) الحاد کی تاریخ: https://doi.org/10.1017/9781108562324.047

66) Sahih Muslim 169b: https://sunnah.com/muslim:169b

67) Sahih Bukhari 3450, 3451, 3452: https://sunnah.com/bukhari:3450

68) Sahih Bukhari 7121: https://sunnah.com/bukhari:7121

69) Revelation 19:20 : https://www.bible.com/bible/111/REV.19.20.NIV

70) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a

71) Daniel 9:24-27: https://www.bible.com/bible/111/dan.9.24-27.NIV

72) Revelation 13:18: https://www.bible.com/bible/111/REV.13.18.NIV

73) اسلامی مہینہ، ترکی کے اسلامی کیلنڈر کنورٹر کے مطابق، 16 اپریل 1917 کے حساب سے نکالا گیا:

https://webspace.science.uu.nl/~gent0113/islam/diyanetcalendar.htm

74) 21 جنوری 1924 کے مطابق

75) 5 مارچ 1953 کے مطابق

76) سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی نے 23 جنوری 1990 کو پارٹی کی طاقت پر اجارہ داری ختم کرنے کے لیے ووٹ دیا، جس سے کثیر الجماعتی نظام کے قیام کی راہ ہموار ہوئی۔

77) 26 دسمبر 1991 کے مطابق

78) Sahih Bukhari 7121: https://sunnah.com/bukhari:7121

79) چین (پیپلز ریپبلک آف چائنا)—1949 سے 1978-1980 کی دہائی تک (ڈینگ ژیاؤپنگ کے تحت اقتصادی اصلاحات)۔

کیوبا—1959 سے 2002 (نظریاتی زور مارتی (خوسے مارتی) اور کاسٹروازم پر دیا گیا)۔

ویتنام (سوشلسٹ ریپبلک آف ویتنام)—1976 سے 1986 تک Đổi Mới اصلاحات)۔

لاوس (لاؤ پیپلز ڈیموکریٹک ریپبلک)—1975 سے 1986 تک (نیو اکنامک میکانزم اصلاحات)۔

شمالی کوریا (ڈیموکریٹک پیپلز ریپبلک آف کوریا)—1948 سے 1992 (جوچے نظریہ سے بدل دیا گیا)۔

سوویت یونین (یو ایس ایس آر)—1922 سے 1991 تک (پیریسترویکا اور زوال)۔

مشرقی جرمنی (جرمن ڈیموکریٹک ریپبلک)—1949 سے 1990 تک (مغربی جرمنی کے ساتھ دوبارہ اتحاد)۔

پولینڈ (پیپلز ریپبلک آف پولینڈ)—1947 سے 1989 تک (جمہوریت کی طرف منتقلی)۔

چیکوسلوواکیہ (چیکوسلوواک سوشلسٹ ریپبلک)—1948 سے 1989 تک (ویلویٹ انقلاب)۔

ہنگری (ہنگری کی عوامی جمہوریہ)—1949 سے 1989 تک (جمہوریت کی طرف منتقلی)۔

رومانیہ (سوشلسٹ ریپبلک آف رومانیہ)—1947 سے 1989 تک (چاؤشسکو کے زوال)۔

بلغاریہ (پیپلز ریپبلک آف بلغاریہ)—1946 سے 1990 تک (جمہوریت کی طرف منتقلی)۔

البانیا (پیپلز سوشلسٹ ریپبلک آف البانیا)—1946 سے 1992 تک (جمہوریت کی طرف منتقلی)۔

یوگوسلاویہ (سوشلسٹ فیڈرل ریپبلک آف یوگوسلاویہ)—1943 سے 1992 تک (آزاد ریاستوں میں تقسیم)۔

منگولیا (منگولین پیپلز ریپبلک)—1924 سے 1990 تک (جمہوری اصلاحات)۔

جنوبی یمن (پیپلز ڈیموکریٹک ریپبلک آف یمن)—1967 سے 1990 تک (شمالی یمن کے ساتھ اتحاد)۔

افغانستان (ڈیموکریٹک ریپبلک آف افغانستان)—1978 سے 1992 تک (کمیونسٹ حکومت کا خاتمہ)۔

انگولا (پیپلز ریپبلک آف انگولا)—1975 سے 1991 تک (کثیر جماعتی نظام اور اقتصادی اصلاحات)۔

موزمبیق (پیپلز ریپبلک آف موزمبیق)—1975 سے 1990 تک (کثیر جماعتی جمہوریت)۔

بینن (پیپلز ریپبلک آف بینن)—1975 سے 1990 تک (جمہوری اصلاحات)۔

کانگو-برازاویلے (پیپلز ریپبلک آف کانگو)—1969 سے 1991 تک (جمہوریت کی طرف منتقلی)۔

ایتھوپیا (ڈیرگ حکومت، بعد میں پیپلز ڈیموکریٹک ریپبلک آف ایتھوپیا)—1974 سے 1991 تک (ڈیرگ حکومت کا خاتمہ)۔

کمبوڈیا (ڈیموکریٹک کمپوچیا، خمیر روج کے تحت)—1975 سے 1979 تک (ویتنامی حملے کے بعد زوال اور پیپلز ریپبلک آف کمپوچیا کا قیام)۔

کمپوچیا (پیپلز ریپبلک آف کمپوچیا)—1979 سے 1993 تک (اقوام متحدہ کے زیر نگرانی امن معاہدوں کے بعد جمہوریت کی طرف منتقلی)۔

تانو توو ا(تووان پیپلز ریپبلک)—1921 سے 1944 تک (سوویت یونین کے ذریعہ الحاق)۔

بیرونی منگولیا (1924 سے قبل منگولین پیپلز ریپبلک)—1921 سے 1924 تک (منگولین پیپلز ریپبلک کا پیش خیمہ)۔

صومالیہ (صومالی ڈیموکریٹک ریپبلک)—1969 سے 1991 تک (ناکام ریاست بننے کے بعد زوال)۔

نکاراگوا (ساندنیستا حکومت کے تحت)—1979 سے 1990 تک (1990 کے انتخابات میں امریکی حمایت یافتہ اپوزیشن سے شکست کے بعد اقتدار کا خاتمہ)۔

گرینیڈا (ماریس بشپ کی نیو جیول موومنٹ کے تحت)—1979 سے 1983 تک (داخلی تنازعات کے بعد امریکی فوجی مداخلت سے خاتمہ)۔

چلی (سالواڈور آلینڈے کے تحت پاپولر یونٹی) – 1970 سے 1973 تک (آگسٹو پنوشے کی قیادت میں امریکی حمایت یافتہ فوجی بغاوت کے ذریعے حکومت کا خاتمہ)۔
80) https://en.wikipedia.org/wiki/List_of_communist_states#/media/File:Communist_Block.svg
81) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
82) Sahih Muslim 2946a: https://sunnah.com/muslim:2946a
83) Princeton University Press, The Rise and Fall of Communism, accessed at: https://assets.press.princeton.edu/chapters/s11095.pdf
84) Sahih Bukhari 19: https://sunnah.com/bukhari:19
85) Sahih Muslim 2945a: https://sunnah.com/muslim:2945a
86) https://en.wikipedia.org/wiki/Lykov_family
87) Sahih Muslim 809a: https://sunnah.com/muslim:809
88) Sahih Muslim 2944: https://sunnah.com/muslim:2944
89) https://encyclopedia.yivo.org/article/982
90) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
91) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
92) https://en.wikipedia.org/wiki/First_five-year_plan_(Soviet_Union)
93) https://en.wikipedia.org/wiki/Stakhanovite_movement
94) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
95) https://en.wikipedia.org/wiki/Holodomor
96) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
97) Sahih Muslim 1380: https://sunnah.com/muslim:1380
98) Sahih Bukhari 7124: https://sunnah.com/bukhari:7124
99) Bukhari 2543: https://sunnah.com/bukhari:2543
100) https://en.wikipedia.org/wiki/Muhammad_ibn_Abd_al-Wahhab
101) Sahih Bukhari 7132: https://sunnah.com/bukhari:7132
102) Sahih Muslim 2938c https://sunnah.com/muslim:2938c
103) Sahih Muslim 2942a: https://sunnah.com/muslim:2942a
104) Sahih Muslim 2538a: https://sunnah.com/muslim/44/310
105) Sahih Bukhari 5902: https://sunnah.com/bukhari:5902
106) Sahih Muslim 2930a: https://sunnah.com/muslim:2930a
107) Sahih Muslim 2937a: https://sunnah.com/muslim:2937a
108) Sahih Muslim 2943a: https://sunnah.com/muslim:2943a
109) Sahih Muslim 2927a: https://sunnah.com/muslim:2927a
110) Sahih Bukhari 5902: https://sunnah.com/bukhari:5902
111) Quran 12:100: https://www.quran.com/12/100
112) Sahih Bukhari 5902: https://sunnah.com/bukhari:5902

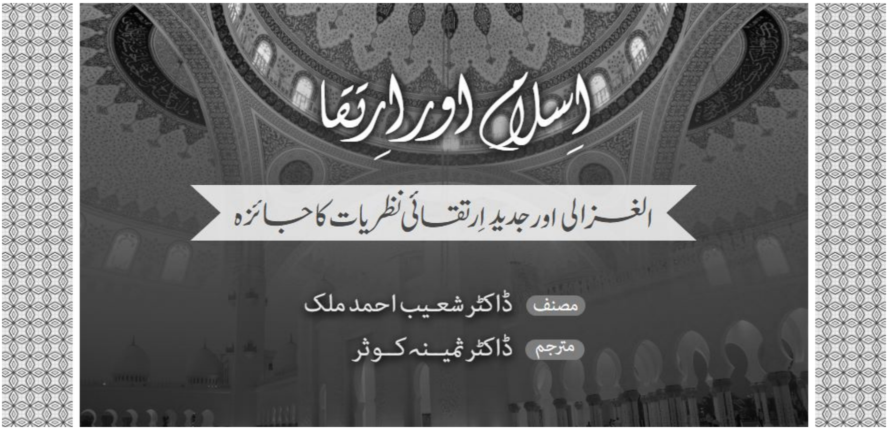

اسلامی متون اور نظریہ ارتقا

تعارف

بہت سے مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے دو بنیادی مآخذ ہیں۔ پہلا مآخذ قرآن مجید ہے، جو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ کلام ہے، نہ کہ پیغمبر محمد ﷺ کا ذاتی اظہار یا الہامی تاثر۔ دوسرا مآخذ احادیثِ نبویؐ ہیں، جو رسول اکرم ﷺ کے اقوال، افعال اور تصویبات پر مشتمل روایتوں کا مجموعہ ہے۔ مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کے نزدیک نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ سند حاصل ہے، جو ان کے قول و فعل کو دینی حجت بناتی ہے۔ اسی بنیاد پر احادیث کو اسلامی شریعت اور دینی فہم میں نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ متعدّد موضوعات ایسے ہیں جو قرآن و حدیث دونوں میں مشترکہ طور پر پائے جاتے ہیں، جیسے فقہی احکام، عقائد، انبیاء کے قصص، اور اخلاقی تعلیمات۔ اگرچہ دونوں مآخذ اپنی نوعیت اور دائرہ کار میں مختلف ہیں، لیکن دینی فہم و عمل کی تشکیل میں یہ ایک دوسرے کے معاون و مکمل حیثیت رکھتے ہیں (Totolli 2020)۔ مثال کے طور پر، قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر مسلمانوں کو نماز قائم کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تاہم نماز کی عملی تفصیلات جیسے رکعات کی تعداد، قراءت کا طریقہ، قیام و سجدہ کی ترتیب، احادیثِ نبوی ﷺ کے ذریعے معلوم ہوتی ہیں، جن کی تعبیر و تفہیم مختلف اصولِ تفسیر کی روشنی میں کی جاتی ہے۔ اسی طرح، بعض قرآنی آیات کا ایک مجموعہ رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے کسی اہم تاریخی واقعے سے مربوط ہوتا ہے، جس کا مکمل پسِ منظر اور سیاق و سباق صرف احادیثِ نبوی ﷺ سے واضح ہوتا ہے (Gorke 2020)۔ قرآن اور حدیث کے مابین ایک اور اہم اور بنیادی فرق یہ ہے کہ قرآن کی تلاوت عبادت کا درجہ رکھتی ہے، جبکہ احادیث کی تلاوت بذاتِ خود عبادت نہیں سمجھی جاتی (Michot 2009; Graham 2020)۔ حدیث کی ساخت کے عمومی طور پر دو اجزاء ہوتے ہیں: پہلا "سند" یعنی وہ سلسلہ

روایت جس میں تمام راویوں کے نام شامل ہوتے ہیں، اور دوسرا "متن" یعنی اصل حدیث یا روایت کا مضمون۔ چونکہ سند ایک تاریخی زنجیر ہے، اس لیے اسے بطور عبادت تلاوت نہیں کیا جاتا، جب کہ متن میں بعض اوقات دعائیہ کلمات شامل ہوتے ہیں اور بعض اوقات نہیں بھی۔ اسی بنا پر بہت سے مسلمان احادیث کو ایک تاریخی و سوانحی ذخیرے کے طور پر دیکھتے ہیں، جس میں رسول اکرم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی زندگی کے مختلف پہلو محفوظ ہیں۔ البتہ وہ احادیث جن میں دعائیں شامل ہوتی ہیں، انہیں انفرادی یا اجتماعی دعا کے مواقع پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ بالآخر، ان مصادر کے مابین ایک نمایاں امتیاز ان کی تاریخی صحت و وثوق (historical integrity) کا ہے۔ جمہور مسلمان اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ قرآن مجید وہی خالص وحی الٰہی ہے جو آغازِ اسلام میں نبی کریم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ پر نازل ہوئی، اور جو صدیوں کے دوران اس قدر کثیر و متواتر ذرائع اور افراد کے ذریعے منقول ہوئی ہے کہ اسے کسی گھڑ جوڑ یا جعل سازی کا نتیجہ قرار دینا علمی اور عقلی طور پر محلِ نظر ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن کی تاریخی صداقت پر مسلم علمی روایت میں شاذ و نادر ہی سوال اٹھایا گیا ہے (Graham 2020)۔

البتہ احادیث کا معاملہ قرآن سے یکسر مختلف ہے۔ نبی کریم صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے اقوال و افعال کو ان کے بعد آنے والے راویوں (محدثین) نے قلمبند کیا اور روایت کے ذریعے منتقل کیا۔ تاہم، بہت سے مسلمانوں کے نزدیک احادیث کی تاریخی سالمیت اور صداقت ایک متنوع اور پیچیدہ موضوع ہے۔ مسلم علما نے ابتدا ہی میں یہ تسلیم کیا کہ بعض افراد نے ذاتی، سماجی یا سیاسی مفادات کے لیے احادیث گھڑنے کی کوشش کی (Brown 2009, 1–66)۔ یہی سبب تھا کہ علمِ حدیث کی تنقیدی روایت نے جنم لیا، جسے تجزیہ احادیث کے عنوان سے جانا جاتا ہے۔ اس علم میں محدثین نے نہ صرف روایت کے اصول و ضوابط مرتب کیے، بلکہ احادیث کی درجہ بندی اور صحیح و ضعیف روایات کے درمیان امتیاز کے معیارات بھی طے کیے (Abdul-Jabbar, 2020a)۔ ان تفصیلات پر باب 9 میں مزید گفتگو کی جائے گی، تاہم یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اگرچہ قرآن کی تاریخی ترسیل پر عام طور پر کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا، مگر احادیث کی جامعیت اور درجہ بندی پر ہمیشہ بحث موجود رہی ہے، اور اسی لیے ان کے مختلف مدارج متعیّن کیے گئے ہیں (Brown 2009)۔

احادیث سے متعلق ایک اہم پہلو توحید کے تصور سے متعلق ہے (Abdul-Jabbar, 2020b)۔ وقت کے ساتھ جب حدیث کی تصدیق اور تنقید کا عمل زیادہ مربوط و مستحکم ہوتا گیا، تو محدثین نے ان احادیث کو باقاعدہ طور پر مجموعوں کی صورت میں مرتب کرنا شروع کیا۔ ان مجموعوں نے حدیث پر کام کرنے والے علما کے لیے ایک عملی فہرست کا کام دیا، جس کی مدد سے وہ از سرِ نو تحقیق کے بجائے مستند اور مصدقہ احادیث پر اپنی فکری و فقہی کاوشوں کی بنیاد رکھ سکیں۔ یہ بات بھی اہم ہے کہ اہلِ سنّت اور اہلِ تشیّع کے ہاں حدیث کی ساخت، متن اور اسناد کے اصولوں میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ چونکہ اس تحقیق کا مرکز امام غزالی کی فکر ہے، جو ایک سنّی عالم تھے، اس لیے یہاں بحث کا دائرہ صرف سنّی احادیث تک محدود رکھا جائے گا۔

سنّی مکتبِ فکر میں چھ مجموعوں کو سب سے زیادہ معتبر تصور کیا گیا ہے، جنہیں صحاحِ ستہ کہا جاتا ہے۔ ان مجموعوں کو عموماً ان کے مرتبین کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے (Abdul-Jabbar, 2020b)۔

سنّی مسلمانوں کے ہاں جن چھ مجموعوں کو حدیث کی سب سے معتبر کتابیں سمجھا جاتا ہے، وہ درج ذیل ہیں، جنہیں صحاحِ ستہ (چھ مستند کتبِ حدیث) کہا جاتا ہے:

۱. صحیح بخاری — امام محمد بن اسماعیل البخاری کی مرتب کردہ، جو صحتِ حدیث کے حوالے سے سب سے معتبر سمجھی جاتی ہے۔

۲. صحیح مسلم — امام مسلم بن الحجاج کی تالیف، جو بخاری کے بعد سب سے مستند سمجھی جاتی ہے۔

۳. سنن النسائی (السنن الصغری) — امام احمد بن شعیب النسائی کی تالیف۔

۴. سنن ابی داؤد — امام ابوداؤد سلیمان بن اشعث کی مرتب کردہ کتاب۔

۵. جامع الترمذی — امام محمد بن عیسیٰ الترمذی کی تالیف، جس میں فقہی آرا کے ساتھ تبصرے بھی شامل ہیں۔

۶. سنن ابن ماجہ — امام ابن ماجہ کی تالیف، جسے بعض علما صحاحِ ستہ میں شامل کرتے ہیں، جبکہ کچھ اس کی جگہ مؤطا امام مالک کو ترجیح دیتے ہیں، جو امام مالک بن انس کی تالیف ہے۔

بعض محدثین مؤطا امام مالک کو صحاحِ ستہ میں شامل کرتے ہیں اور ابن ماجہ کو اس فہرست سے خارج کرتے ہیں، لیکن عام طور پر مذکورہ بالا چھ کتابیں ہی صحاحِ ستہ کے طور پر معروف ہیں۔

یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ مذکورہ چھ کتب احادیث کی تمام تالیفات کی نمائندگی نہیں کرتیں، بلکہ یہ ان میں سے سب سے زیادہ مقبول اور معتبر سمجھی جانے والی مجموعات ہیں۔ صحاحِ ستہ میں بالخصوص صحیح بخاری اور صحیح مسلم — جنہیں مجموعی طور پر صحیحین (دو مستند مجموعے) کہا جاتا ہے — کو اعلیٰ ترین سند کا درجہ حاصل ہے، اور ان میں سے بھی صحیح بخاری کو سب سے زیادہ قبولِ عام حاصل ہے (Brown 2009, 31–32)۔

جیسا کہ آگے واضح ہوگا، حضرت آدم کی تخلیق اور اس سے متعلقہ روایات (جن کا تعلق براہِ راست نظریہ ارتقا سے بنتا ہے) زیادہ تر انہی دو مجموعوں یعنی صحیحین میں مذکور ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان احادیث کی صداقت کو چیلنج کرنا یا ان کا انکار کرنا ایک نہایت نازک اور سنجیدہ مسئلہ بن جاتا ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر، احادیث کی درجہ بندی اور اس پر ہونے والے مباحث کو باب 9 میں تفصیل سے بیان کیا جائے گا۔ یہ باب بنیادی طور پر ان تمام متعلّقہ صحیفائی نکات کو سادہ اور قابلِ فہم انداز میں، بغیر تکنیکی اصطلاحات کے، قارئین کے سامنے رکھنے پر مرکوز ہوگا۔

اس باب کا مقصد دو پہلوؤں کا احاطہ کرنا ہے۔ اولاً، ہم ان قرآنی آیات اور احادیث کا جائزہ لیں گے جو اسلام اور نظریۂ ارتقاء کے مابین بحث سے متعلق ہیں۔ یہ بحث باب چہارم کے لیے ایک تمہیدی کردار ادا کرے گی، جہاں ہم اُن مختلف طریقوں کا تجزیہ کریں گے جن کے ذریعے مسلمان مفکرین نے ارتقائی نظریات کے ساتھ اسلامی عقائد میں تطبیق یا

عدم تطبیق کی کوشش کی ہے۔ یوں باب سوم اور باب چہارم کے مابین یہ فکری ربط، باب نہم کے لیے ایک علمی پس منظر فراہم کرے گا، جہاں امام غزالی کے منطقی طریقۂ کار کو زیر بحث لایا جائے گا۔ وہ طریقہ کار جس کی روشنی میں اسلامی روایت میں مصالحت کی گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ بعدازاں، باب دہم میں اسلام اور ارتقاء کے باہمی تعلق کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔ ثانیاً، اس باب کا مقصد یہ بھی ہے کہ متعلقہ اسلامی صحیفوں کا تقابلی مطالعہ ان عیسائی مفاہیم سے کیا جائے جنہیں باب دوم میں نمایاں کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، بعض مسائل عیسائی مذہبی روایت میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں، لیکن اسلامی متون اور فکری روایت میں ان کا کوئی صریح یا مضبوط حوالہ موجود نہیں ہے۔ یہ دونوں اہداف، اپنی بیان کردہ ترتیب کے ساتھ، اس باب کی ساخت اور مباحث کا تعین کرتے ہیں۔

اسلامی متون میں تخلیق کا تصور

اس حصے میں ہم تخلیق سے متعلق قرآنی آیات اور احادیث کا جائزہ لیں گے۔ وضاحت اور ترتیب کے لیے اس بحث کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے:

۱. آسمانوں اور زمین کی تخلیق

۲. غیر انسانی حیات کی تخلیق

۳. آدمؑ کی تخلیق

ہم ان تینوں موضوعات کے تحت متعلقہ آیات اور احادیث کو اسی ترتیب سے زیرِ بحث لائیں گے۔

زمین و آسمان کی تخلیق

قرآن مجید، بائبل کی طرح اس بات کا ذکر کرتا ہے کہ اللہ تعالی نے ہر چیز کو چھ دنوں میں پیدا فرمایا۔ درج ذیل دو مثالیں اس کی وضاحت کرتی ہیں:

۱. تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (ستہ أیام) میں پیدا کیا، پھر عرش پر جلوہ گر ہوا؛ وہی رات کو دن پر اس طرح لپیٹ دیتا ہے کہ وہ تیزی سے اس کے پیچھے دوڑتا ہے؛ اس نے سورج، چاند اور ستاروں کو اپنے حکم کے تابع بنایا؛ ساری تخلیق اور حکم اسی کا ہے۔ اللہ، جو تمام جہانوں کا رب ہے، بہت بلند و بالا ہے! (القرآن 7:54)

۲. تمہارا رب اللہ ہی ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں (ستہ أیام) میں پیدا کیا، پھر عرش پر جلوہ گر ہوا، وہی تمام امور کی تدبیر کرتا ہے؛ کوئی اس کی اجازت کے بغیر سفارش نہیں کر سکتا: یہی اللہ تمہارا رب ہے، پس اسی کی عبادت کرو۔ آخر تم نصیحت کیوں نہیں پکڑتے؟ (القرآن 10:3)

یہ آیات بظاہر یہ بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ تاہم کلاسیکی عربی زبان میں "ایام" کا مفہوم لسانی طور پر وسعت رکھتا ہے۔ اس سے مراد چوبیس گھنٹے والے دن بھی ہو سکتے ہیں، یا یہ کسی بھی مدت کے چھ اَدوار یا مرحلے بھی ہو سکتے ہیں جن کی کوئی معیّن طوالت نہیں (Mabud 1991, 54–57; Jalajel 2009, 36)۔ خود قرآن مجید میں بھی اس لسانی وسعت کا استعمال دیگر مقامات پر کیا گیا ہے:

وہ آپ (نبی ﷺ) سے عذاب کو جلد لانے کا مطالبہ کریں گے۔ حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا -آپ کے رب کے ہاں ایک دن تمہارے شمار کے مطابق ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ (القرآن 22:47)

ایام (یعنی دنوں) کے مفہوم میں پائے جانے والے ابہام کے علاوہ، ان چھ دنوں کی مدت کے بارے میں بھی غیر یقینی صورتحال پائی جاتی ہے۔ یہ دن مساوی طوالت کے ہو سکتے ہیں، یا ایک دوسرے سے بالکل مختلف مدت کے حامل بھی ہو سکتے ہیں۔ اسلامی متون میں ایسی کوئی صراحت موجود نہیں جو کسی ایک مفروضے کو حتمی طور پر درست قرار دے (Jalajel 2009, 36)۔ آخر میں، یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا تخلیق کے عمل کی کوئی ترتیب قرآن میں بیان ہوئی ہے؟ ابتدائی دو آیات اس معاملے میں غیر جانب دار معلوم ہوتی ہیں کیونکہ وہ آسمان و زمین کو ایک ساتھ ذکر کرتی ہیں، یعنی یہ بیان کرتی ہیں کہ آسمان اور زمین چھ دنوں میں تخلیق کیے گئے۔ اس لیے یہ آیات کسی واضح زمانی ترتیب کی طرف اشارہ نہیں کرتیں۔ تاہم، قرآن کے ایک اور مقام پر بظاہر ایک زمانی ترتیب نظر آتی ہے:

اِن سے پوچھو، کیا تم اُس ہستی کا انکار کر رہے ہو جس نے دو دنوں میں زمین بنائی، اور اُس کے شریک ٹھیراتے ہو؟ یہ ہے جہانوں کا پروردگار۔ اور اُس نے زمین کے اندر اُس کے اوپر سے پہاڑ گاڑ دیے اور اُس میں برکتیں رکھ دیں اور سب ضرورت مندوں کے لیے یکساں، اُس کی غذائیں اُس میں ودیعت کر دیں۔ یہ سب ملا کر چار دنوں میں۔ پھر اُس نے آسمان کی طرف توجہ فرمائی جو (زمین کے ساتھ ہی وجود میں آچکا تھا اور) اُس وقت دھوئیں کی صورت میں تھا۔ سو اُس کو اور زمین کو حکم دیا کہ حاضر ہو جاؤ، خوشی سے یا ناخوشی سے۔ دونوں نے کہا: ہم خوشی سے حاضر ہیں۔ پھر دو دنوں میں اُنھیں سات آسمان بنا دیا اور ہر آسمان میں اُس کا قانون وحی کر دیا اور تمھارے اِس قریبی آسمان کو ہم نے چراغوں سے رونق دی اور اُسے خوب محفوظ بنا دیا۔ یہ خداے عزیز و علیم کا منصوبہ ہے۔ (القرآن 41:9-12)

ان آیات میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ زمین اور اس کے اجزا کی تخلیق پہلے ہوئی، اور اس کے بعد آسمانوں کی تخلیق کا ذکر آیا ہے۔ "پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا"۔۔اسی ترتیب کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس ترتیب کو زمانی معنوں میں بھی سمجھا جا سکتا ہے، اور فضیلت یا درجہ بندی کے طور پر بھی۔ اگر دوسرے مفہوم کو اختیار کیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آسمان زمین سے زیادہ اہم یا برتر ہیں (Maaboud 1991, 58; Jalajel 2009, 38)۔ اسی طرح قرآن میں بھی ثم کا استعمال ہمیشہ زمانی ترتیب کے لیے نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات یہ کسی چیز کی اہمیت، تدریج یا توجہ کی منتقلی کو ظاہر کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔

اسی اصول پر قاضی بیضاوی، جو ایک معروف مفسر ہیں سورۃ البقرۃ کی آیت 29 کی تفسیر میں لکھتے ہیں: "لفظ ثم یہاں بظاہر مخلوقات کے درمیان فرق اور آسمان کی تخلیق کو زمین پر فضیلت دینے کے لیے ہے"۔ لہٰذا، یہ کہنا درست نہیں ہوگا کہ قرآن کسی حتمی تاریخی تسلسل کو بیان کرتا ہے۔ ایک حدیث جو صحیح مسلم کے باب "ابتداء الخلق وخلق آدم علیہ السلام" میں روایت ہوئی ہے، بظاہر ایک حتمی ترتیب فراہم کرتی ہے اور بعض پہلوؤں سے قرآن کے بیانیے سے متصادم معلوم ہوتی ہے:

اللہ تعالیٰ نے مٹی کو ہفتے کے دن پیدا کیا، اتوار کے دن پہاڑ بنائے، پیر کے دن درخت پیدا کیے، منگل کے دن ناپسندیدہ چیزیں (یعنی تکلیف دہ اور ضرررساں چیزیں) پیدا کیں، بدھ کے دن نور پیدا کیا، جمعرات کے دن زمین میں جانور پھیلائے، اور جمعہ کے دن عصر کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کیا، تمام مخلوقات کے بعد، دن کے آخری حصے اور رات کے آغاز کے درمیان۔

یہ روایت اس امر کی نشاندہی کرتی ہے کہ تخلیق سات دنوں میں مکمل ہوئی، جبکہ قرآن میں چھ دنوں کا ذکر ہے۔ تاہم، جیسا کہ جلاجل (2009,38–42) نے مناسب طور پر نشاندہی کی ہے، اس حدیث کے حوالے سے چند اہم نکات درج ذیل ہیں:

۱. اس حدیث کی سند میں اشکالات موجود ہیں، جن کی طرف علمائے حدیث نے اشارہ کیا ہے۔
۲. احادیث کی دیگر کتب میں اس حدیث کے مختلف نسخے موجود ہیں، جن میں ترتیب یا تفصیلات کا اختلاف پایا جاتا ہے، جو اس روایت کی قطعیت کو مشکوک بنا دیتا ہے۔
۳. حتیٰ کہ اگر اس حدیث کو ظاہر پر لیا جائے، تب بھی قرآن کی بیان کردہ چھ دنوں کی مدت سے متصادم نہیں، کیونکہ قرآن کی "چھ ایام" کی اصطلاح لچکدار مفہوم رکھتی ہے اور مختلف ادوار کو ظاہر کر سکتی ہے۔
۴. اس حدیث کا براہِ راست آسمانوں اور زمین کی تخلیق سے تعلق نہیں۔ اس میں صرف مٹی، روشنی اور جانوروں جیسے عناصر کا ذکر ہے، مگر سیاروں، کہکشاؤں یا زمین کی ساخت کی تخلیق کو حتمی طور پر بیان نہیں کرتی۔

درج بالا نکات کی روشنی میں یہ حدیث کسی قطعی زمانی ترتیب کی بنیاد فراہم نہیں کرتی۔ اسلامی متون کائنات اور زمین کی تخلیق کو 24 گھنٹوں پر مشتمل چھ دنوں میں مکمل کرنے کا کوئی حتمی نظریہ پیش نہیں کرتے، اور نہ ہی ان چھ دنوں یا ادوار کی یکسانیت یا ترتیب کے بارے میں کوئی قطعی تفصیل موجود ہے۔ نتیجتاً، کوئی واضح تاریخی تسلسل سامنے نہیں آتا۔ تخلیق سے متعلق دیگر آیات بھی موجود ہیں، لیکن اس بحث کا مرکزی نکتہ تخلیق کا دورانیہ تھا۔ باقی تفصیلات کا ارتقائی مباحث سے براہ راست تعلق نہیں ہے۔

غیر انسانی مخلوقات کی تخلیق

قرآنِ مجید میں بارہا یہ ذکر آیا ہے کہ اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ تاہم، اسلامی متون میں جاندار مخلوقات کی تخلیق کی تفصیلات (فی الحال حضرت آدمؑ یا انسان کی تخلیق کو چھوڑ کر) کچھ مبہم سی معلوم ہوتی ہیں۔ اس میں زندگی کی ابتدا اور انواع (species) کی ابتدا دونوں شامل ہیں۔ قرآن کی ایک آیت اس جانب اشارہ کرتی ہے کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا:

کیا منکر لوگ نہیں دیکھتے کہ آسمان اور زمین (پہلے) جُڑے ہوئے تھے، پھر ہم نے انہیں پھاڑ کر جدا کیا؟ اور ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی سے پیدا کیا۔

کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے؟ (القرآن، 21:30)

ایک دوسری آیت میں بھی یہی تذکرہ ملتا ہے:

اور اللہ نے ہر جان دار کو پانی (یعنی مخصوص سیال مادے) سے پیدا کیا، پھر ان میں سے کوئی اپنے پیٹ کے بل چلتا ہے، کوئی دو پاؤں پر، اور کوئی چار پر چلتا ہے۔ اللہ جو چاہے پیدا کرتا ہے، یقیناً اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ (القرآن، 24:45)

اگرچہ یہ دونوں آیات جانداروں کی تخلیق کو پانی سے جوڑتی ہیں، لیکن اس عمل کی تفصیل بیان نہیں کی گئی کہ یہ تخلیق پانی سے کس طریقے سے واقع ہوئی۔

قرآن مجید میں پودوں کا بھی ذکر آتا ہے:

اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تم زمین کو خشک و سنّاٹا دیکھتے ہو، پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ جنبش کرنے لگتی ہے اور پھولنے لگتی ہے۔ یقیناً وہ ذات جو اس کو زندگی بخشتی ہے، وہ مردوں کو بھی زندگی دے گی۔ بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ (القرآن، 41:39)

اس آیت میں ہم دیکھ سکتے ہیں کہ خدا اپنی تخلیقی قوتوں کا ذکر کر رہا ہے کہ جب بنجر زمین پر بارش برسائی جاتی ہے تو یہ زندگی، یعنی پودوں کے ساتھ نشوونما پا سکتی ہے۔ ایک اور آیت ہے جہاں زندگی اور موت کا موضوع پودوں کے بیجوں سے منسلک ہے:

اللہ ہی ہے جو دانے اور گٹھلی کو پھاڑ کر اس میں سے (نیا) اگاتا ہے؛ وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے پیدا کرتا ہے — یہی اللہ ہے، پھر تم کہاں بھٹکائے جا رہے ہو؟ (القرآن 6:95)۔

قرآن مجید میں جانوروں کا بھی کثرت سے ذکر آیا ہے، جیسے کہ چیونٹیاں (سورۃ النمل 27:18)، کتے (سورۃ الاعراف 7:176)، پرندے (سورۃ الانعام 6:38؛ سورۃ النحل 16:79)، مکڑی (سورۃ العنکبوت 29:41)، گدھے (سورۃ النحل 16:8؛ سورۃ لقمان 31:19)، اور دیگر بہت سے جانور۔ ان کا ذکر بعض اوقات مثال (تمثیل) کے طور پر کیا گیا ہے یا کسی

واقعے میں بطور کردار ذکر کیا گیا ہے، خواہ وہ کسی نبی سے متعلق ہو یا عام انسانوں سے۔ قرآن میں ایک خاص حوالہ مویشیوں (چوپایوں) کے بارے میں بھی آیا ہے، جن کا ذکر اللہ کے ہاتھوں کی تخلیق کے ساتھ کیا گیا ہے:

اور مویشیوں کو بھی اللہ ہی نے پیدا کیا، ان میں تمہارے لیے گرمی کا سامان ہے اور دیگر فائدے بھی، اور ان میں سے کچھ کو تم کھاتے ہو۔ (القرآن، 16:5)

ایک اور آیت میں قرآن مجید بیان کرتا ہے کہ مویشی (چوپائے) اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں کے لیے نازل کیے گئے:

اس نے تم سب کو ایک جان سے پیدا کیا، پھر اسی سے اس کا جوڑا بنایا، اور تمہارے لیے آٹھ قسم کے مویشی نازل کیے۔ وہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹ میں ایک مرحلے کے بعد دوسرے مرحلے میں تین اندھیروں کے اندر تخلیق کرتا ہے۔ یہی اللہ تمہارا رب ہے، بادشاہی اسی کی ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، پھر تم کدھر بھٹکائے جا رہے ہو؟ (القرآن، 39:6)

تاہم، جب ان باتوں کو نظریہ ارتقا کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی ایسا پہلو نہیں جو اس نظریے سے واضح طور پر ٹکراتا ہو۔ جیسا کہ ہم اگلے حصے میں بھی دیکھیں گے، قرآن کی ایک آیت میں یہ ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا۔ بعض افراد نے اس بات کو بنیاد بنا کر یہ کہا ہے کہ حضرت آدمؑ ارتقائی عمل کا حصہ نہیں تھے، بلکہ یہ ایک خصوصی تخلیق (special creation) کی طرف اشارہ ہے (Keller 2011, 350–364)۔ تاہم، اللہ کے "ہاتھوں" کا ذکر صرف آدمؑ کے بارے میں ہی نہیں آیا۔ ایک اور مقام پر قرآن بیعت کے واقعے کے دوران بھی اللہ کے "ہاتھ" کا ذکر کرتا ہے۔ (القرآن، 48:10)

ان تمام حوالوں سے اگر کچھ ظاہر ہوتا ہے تو وہ یہ ہے کہ ان امور کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن ان سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ لازمی طور پر فوری تخلیق (instantaneous creation) کو بیان کر رہے ہیں یا نظریہ ارتقا کا قطعی انکار کر رہے ہیں، درست نہیں ہے۔

جہاں تک مویشیوں سے متعلق دوسری آیت کا تعلق ہے (القرآن 39:6)، جلاجل (2009,44–47) اس آیت میں استعمال ہونے والے لفظ "نَزَّلَ" کے مفہوم پر مفسرین کے درمیان اختلاف کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لغوی طور پر "نَزَّلَ" کا مطلب آسمان سے اتارنا ہوتا ہے۔ اگر اسے اسی طرح لیا جائے تو اس سے یہ مفہوم نکل سکتا ہے کہ مویشی آسمان سے نازل ہوئے، جو کہ نظریہ ارتقا کے نظریے سے ایک ممکنہ تضاد پیدا کر سکتا ہے۔ تاہم، جیسا کہ جلاجل (2009, 45) واضح کرتے ہیں کہ: مفسرین مختلف لسانی روایات کی بنیاد پر متعدّد تجاویز پیش کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی بھی تجویز قطعی نہیں ہے۔ ان کی بعض تجاویز کا مطلب یہ ہے کہ جس تخلیق کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ ابتدائی تخلیق ہے۔ ان مویشیوں میں سے دوسری تشریحات ان کی مسلسل تخلیق اور رزق کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔

ان مختلف آرا کو مد نظر رکھتے ہوئے، مویشیوں سے متعلق دوسری آیت ارتقائی عمل کے ذریعے مویشیوں کے پیدا ہونے کے امکان کی نفی نہیں کرتی۔ قرآن میں ایسی آیات بھی موجود ہیں جن میں ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو جوڑوں (pairs) کی صورت میں پیدا کیا:

پاک ہے وہ (اللہ) جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے، خواہ وہ زمین کی پیداوار ہو، یا خود ان کے (انسانوں کے) اپنے وجود سے، یا وہ چیزیں جنہیں وہ جانتے ہی نہیں۔ (القرآن 36:36) اور ہم نے ہر چیز کو جوڑوں کی صورت میں پیدا کیا تاکہ تم غور وفکر کرو۔ (القرآن 51:49)

یہ آیات بظاہر اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جانوروں اور/یا پودوں کو جوڑوں (یعنی نر و مادہ) کی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ اس تعبیر کو بعض اوقات دو صنفی ساخت (binary gender) کے طور پر لیا جا سکتا ہے، یعنی صرف نر یا مادہ۔ تاہم، پہلی آیت (القرآن 36:36) اس مفہوم کو محض جنسی دوگانگی تک محدود نہیں کرتی۔ آیت میں یہ بھی فرمایا گیا ہے: "اور ان چیزوں کے بھی، جنہیں وہ جانتے ہی نہیں" جو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نر و مادہ کی تقسیم سے ماورا مخلوقات بھی ہو سکتی ہیں۔

جہاں تک دوسری آیت (القرآن 51:49) کا تعلق ہے، تو مفسرین نے بھی اس آیت کی تفسیر صرف جنس تک محدود نہیں کی۔ کیونکہ آیت میں کوئی مخصوص قید نہیں، اس لیے انہوں نے اسے دیگر متضاد جوڑوں پر بھی منطبق کیا جیسے کہ: گرمی و سردی، خشکی و تری، رات و دن، کڑواہٹ و مٹھاس وغیرہ (Shafi 2008a, 385–386; Nasr 2015, 1076, 1278)۔ اگرچہ صنفی جوڑوں کا مفہوم ان آیات میں شامل ہو سکتا ہے، لیکن ان کا مفہوم صرف اسی تک محدود نہیں۔ اس وضاحت کی اہمیت اس لیے ہے کہ بعض لوگ ان آیات کو بنیاد بنا کر یہ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلامی متون صرف صنفی دوگانگی کو تسلیم کرتے ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بعض جانداروں (مثلاً کچھ قسم کی چھپکلیاں) میں واحد جنسی (unisexual) تولیدی نظام پایا جاتا ہے جو اس تقسیم سے باہر ہے۔ مگر چونکہ ان آیات کے کئی ممکنہ اور قابلِ قبول معانی موجود ہیں، اس لیے یہ تضاد ضروری نہیں کہ واقع ہو۔ اس مختصر جائزے کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی متون میں ایسا کوئی قطعی بیان موجود نہیں جو پودوں یا جانوروں کی ارتقائی تخلیق کی تردید کرتا ہو۔

بعض معاصر مسلم مفکرین نے غیر انسانی ارتقا (non-human evolution) کو انسانی ارتقا سے الگ تسلیم کیا ہے اور ان کے نزدیک اس میں کوئی دینی یا فکری قباحت نہیں، مثلاً Qadhi and Keller (2011, 350–364) اور Khan (2018)، جن کا تفصیلی جائزہ ہم باب 4 میں پیش کریں گے۔

حضرت آدمؑ کی تخلیق

آدمؑ کی تخلیق سے متعلق عناصر کا ذکر قرآنِ مجید میں مختلف جگہوں پر آیا ہے۔ یہ بیانات کسی زمانی ترتیب کی پیروی نہیں کرتے (کیونکہ قرآن خود زمانی ترتیب کے مطابق مرتب نہیں کیا گیا اور نہ ہی وہ تاریخ کو زمانی تسلسل سے بیان کرتا ہے)۔ سب سے پہلے، قرآن انسان کی تخلیق سے متعلق عمومی دعویٰ کرتا ہے کہ اسے ابتدائی مادی عناصر جیسے کہ مٹی، زمین، مختلف اقسام کی مٹی (مثلاً خشک یا چکنی)، سیاہ گارا، اور نطفہ سے پیدا کیا گیا:

لوگو! اگر تمہیں دوبارہ جی اٹھنے (قیامت) میں شک ہے، تو (یاد رکھو) ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے، پھر لوتھڑے سے جو چمٹنے والا ہوتا ہے، پھر گوشت کے لوتھڑے سے، جو کبھی مکمل صورت والا ہوتا ہے اور کبھی نامکمل۔ ہم یہ (سب) اس لیے کرتے ہیں تاکہ تم پر اپنی قدرت واضح کر دیں۔ (القرآن، 22:5)

اور ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا۔ اس نے کہا: اے میری قوم! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور تمہیں اس میں بسایا، لہٰذا اسی سے معافی مانگو اور اسی کی طرف رجوع کرو۔

یقیناً میرا رب قریب ہے، دعاؤں کا جواب دینے والا ہے۔ (القرآن، 11:61)

وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت مقرر کی، اور ایک اور وقت مقرر ہے جو صرف اسی کو معلوم ہے؛

پھر تم شک کرتے ہو۔ (القرآن، 6:2)

پس (اے نبی!) ان منکروں سے پوچھو: کیا ان کا پیدا کیا جانا زیادہ مشکل ہے یا ہماری دیگر مخلوقات کا؟

ہم نے انہیں چپکنے والی مٹی سے پیدا کیا۔ (القرآن، 37:11)

ہم نے انسان کو سیاہ بدبودار گارے سے بنی ہوئی خشک مٹی سے پیدا کیا۔ (القرآن، 15:26)

انسان کو چاہیے کہ وہ غور کرے کہ اسے کس چیز سے پیدا کیا گیا۔ اسے ایک اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا، جو پیٹھ اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان سے نکلتا ہے۔ (القرآن، 86:5–8)

ایک حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین سے مٹی کی ایک مٹھی بھر لی اور اس سے حضرت آدمؑ کا بے جان جسم بنایا (صحیح مسلم 2611)۔ یہ روایت اُن آیات سے مطابقت رکھتی ہے جن میں ذکر ہے کہ اللہ نے آدم کو ان بنیادی مادی عناصر سے پیدا کیا اور پھر اس میں روح (رُوح) پھونکی۔:

ایسا ہی ہے وہ (اللہ) جو ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کو جانتا ہے، وہی زبردست، رحم فرمانے والا ہے، جس نے ہر چیز کو اس کی بہترین صورت عطا کی۔ اُس نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس کی نسل کو ایک حقیر پانی کے نچوڑ سے بنایا۔ پھر اُس نے

اُسے درست شکل دی، اور اُس میں اپنی روح پھونکی، اور تمہیں سماعت، بصارت، اور عقل عطا کی — مگر تم بہت کم شکر ادا کرتے ہو۔ (القرآن، 6:32–9)

اور (یاد کرو) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: میں سیاہ بدبودار گارے سے بنی ہوئی خشک مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں۔ پھر جب میں اسے ٹھیک صورت میں بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم سب اس کے آگے سجدہ میں گر پڑنا۔ (القرآن، 28:15–29)

اور جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب میں اسے درست شکل دے دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں، تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر پڑنا۔ (القرآن، 71:38–72)

ایک اور حدیث میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں، جبکہ خود آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے: تمام لوگ آدم کی اولاد ہیں، اور آدم مٹی سے [پیدا کیے گئے] تھے۔ (ترمذی 3955) اسی طرح بنی آدم (آدم کی اولاد) کا تصور قرآن میں بھی ملتا ہے،

جیسے کہ سورۃ الاعراف 7:27 اور سورۃ یٰسین 36:60 میں۔ مزید یہ کہ بعض احادیث میں حضرت آدمؑ کو انسانیت کا باپ قرار دیا گیا ہے:

قیامت کے دن مؤمنین جمع ہو کر کہیں گے کہ آؤ، کسی کو تلاش کریں جو ہمارے لیے ہمارے رب کے حضور سفارش کرے۔ پھر وہ آدمؑ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: آپ تمام انسانوں کے والد ہیں، اللہ نے آپ کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، فرشتوں کو حکم دیا کہ آپ کو سجدہ کریں، اور آپ کو تمام چیزوں کے نام سکھائے؛ لہٰذا، ہمارے رب کے حضور ہماری سفارش کیجیے تاکہ وہ ہمیں اس حال سے نجات دے۔ تو آدمؑ جواب دیں گے، میں اس (یعنی تمہاری سفارش) کے لائق نہیں ہوں۔ (بخاری 4476)

لوگو! تمہارا رب ایک ہے، اور تمہارا باپ (آدم) بھی ایک ہے۔ یقیناً کسی عربی کو کسی عجمی پر، اور نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر، اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر، اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل ہے، سوائے تقویٰ کے۔ (احمد 23479)

یہ آیات و روایات اُن احادیث کے ساتھ مربوط ہوتی ہیں جو اگرچہ کم واضح ہیں، لیکن بالواسطہ طور پر انسانیت کے لیے آدمؑ کی اہمیت کو قائم رکھتی ہیں۔ وہ حدیث جس کا ہم نے پہلے ذکر کیا، جس میں بیان ہوا ہے کہ آدمؑ کو جمعہ کے دن پیدا کیا گیا، اسی روایت کی تائید کرتی ہے۔

قرآن مجید میں بعض ایسی آیات بھی ہیں جو واضح طور پر اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ انسانیت کا نسب ایک ہی جوڑے یعنی حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ سے ملتا ہے:

لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان (نَفْسٍ وَاحِدَةٍ) سے پیدا کیا، اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت پھیلا دیے۔ اللہ سے ڈرو، جس کے نام پر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو، اور رشتے ناتوں کو توڑنے سے بچو۔ بے شک اللہ تم پر نگہبان ہے۔ (القرآن، 4:1)

وہی ہے جس نے تم سب کو ایک جان (نَفْسٍ وَاحِدَةٍ) سے پیدا کیا، اور اس سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ وہ اس کے پاس سکون پائے۔ (القرآن، 7:189)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا، باخبر ہے۔ (القرآن، 49:13)

یقیناً، پہلی دو آیات میں "اُس کا جوڑا" سے مراد حضرت حوّا ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ پہلی آیت (القرآن 4:1) کی دو تفسیریں پائی جاتی ہیں۔

یہ فرق اس بات پر مبنی ہے کہ "اس سے" (یعنی مِنْهَا) کا مفہوم کس طرح لیا جائے، جس کے نتیجے میں حضرت حوّا کی تخلیق سے متعلق دو قدرے مختلف تصورات سامنے آتے ہیں۔ Haleem (2011, 135) نے ان دونوں آرا کا فرق نہایت خوبی سے یوں بیان کیا ہے۔ اس سے "(مِنْهَا) عربی زبان میں ایک غیر واضح تعبیر ہے، جس کی بنا پر اس کے دو تفسیری مفاہیم سامنے آتے ہیں، اور دونوں کی تائید میں دلائل موجود ہیں۔

پہلی تفسیر کے مطابق، حضرت آدمؑ کے جسم کا ایک حصہ لے کر حضرت حوّا کو پیدا کیا گیا۔ یہ رائے اُس مشہور روایت سے مطابقت رکھتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ حضرت حوّا کو آدمؑ کی پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ دوسری تفسیر کے مطابق، حضرت حوّا کو حضرت آدمؑ کی ہی نوع یا اصل سے پیدا کیا گیا۔ یہ جسمانی تعبیر نہیں، بلکہ ایک ماورائی (metaphysical) نکتہ ہے، جس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ دونوں کی تخلیق ایک جیسی حقیقت پر مبنی ہے۔ دونوں آرا اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت حوّا کی تخلیق کسی نہ کسی تعلق سے حضرت آدمؑ کے ساتھ معجزانہ طور پر ہوئی۔ عام طور پر ان دونوں تفسیروں کو ہی اس آیت کی قابلِ قبول ممکنہ تعبیرات کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ (امام فخر الدین رازی، 2000، ص 131؛ ابن الجوزی، 2002، ص 253؛ سید حسین نصر، 2015، ص 189)

مزید برآں، آدمؑ اور حواؑ کا دنیا میں اتارے جانے کا واقعہ قرآن مجید میں متعدّد مقامات پر واضح طور پر بیان کیا گیا ہے۔ مندرجہ ذیل آیات اسی واقعہ کو بیان کرتی ہیں:

(اے نبی!) جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا: "میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں،" تو انہوں نے کہا: "کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو رکھیں گے جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خون بہائے گا، حالانکہ ہم آپ کی حمد و ثنا

کرتے ہیں اور آپ کی پاکی بیان کرتے ہیں؟" اللہ نے فرمایا: "میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔" پھر اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھائے، پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: "اگر تم سچے ہو تو ان کے نام مجھے بتاؤ۔" انہوں نے کہا: "آپ پاک ہیں! ہم تو صرف اتنا ہی جانتے ہیں جتنا آپ نے ہمیں سکھایا ہے، بے شک آپ ہی علم والے، حکمت والے ہیں۔" پھر اللہ نے فرمایا: "اے آدم! تم ان کے نام انہیں بتاؤ۔" جب آدم نے انہیں ان کے نام بتائے تو اللہ نے فرمایا: "کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں جانتا ہوں، اور وہ بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو چھپاتے ہو؟" اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا: "آدم کو سجدہ کرو،" تو انہوں نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے؛ اُس نے انکار کیا، تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا۔ اور ہم نے کہا: "اے آدم! تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو، اور جہاں سے چاہو، بے روک ٹوک کھاؤ، مگر اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم دونوں ظالموں میں شمار ہو گے۔" پھر شیطان نے ان دونوں کو پھسلا دیا اور انہیں اُس حالت سے نکال دیا جس میں وہ تھے۔ ہم نے فرمایا: "تم سب یہاں سے نیچے اُتر جاؤ! تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اور زمین میں تمہارے لیے ایک وقت تک رہائش اور سامانِ زیست ہو گا۔" پھر آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمات سیکھے، تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی، بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا، نہایت مہربان ہے۔ ہم نے فرمایا: "تم سب یہاں سے نیچے اُتر جاؤ، پھر جب میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی (اور وہ ضرور آئے گی)، تو جو میری ہدایت کی پیروی کرے گا، ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور جو لوگ کفر کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ دوزخ والے ہوں گے، اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔" (القرآن، 2:31–39)

یہ حضرت آدمؑ کے جنت سے زمین پر نزول کا ایک عمومی خاکہ ہے۔ اس واقعے کا آغاز اللہ تعالیٰ کی جانب سے حضرت آدمؑ کی تخلیق سے ہوتا ہے، جس نے انہیں زمین پر اپنا نائب (خلیفہ) بنا کر بھیجا۔ (یہاں ان آیات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے جن میں ذکر آیا تھا کہ آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا، اور پھر ان میں روح پھونکی گئی۔) فرشتے، جب یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہا ہے، تو سوال کرتے ہیں کہ اسے کیوں پیدا کیا جا رہا ہے، کیونکہ وہ (یعنی انسان) زمین پر فساد کرے گا اور خون بہائے گا۔ اللہ تعالیٰ ان پر واضح کرتے ہیں کہ وہ ایسی چیزیں جانتا ہے، جو فرشتے نہیں جانتے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ حضرت آدمؑ کو تمام اشیا کے نام سکھاتے ہیں، اور فرشتوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان کے نام بتائیں، جو وہ ظاہر ہے نہیں بتا پاتے۔ پھر فرشتوں کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ آدمؑ کو سجدہ کریں، جسے سب فرشتے بجا لاتے ہیں، سوائے ابلیس کے، جو تکبر کی وجہ سے انکار کر دیتا ہے۔ پھر آدمؑ اور ان کی بیوی کو جنت میں رہنے کی اجازت دی جاتی ہے مگر ایک درخت کے قریب جانے سے منع کیا جاتا ہے۔

تاہم، شیطان ان کو بہکاتا ہے، جس کے نتیجے میں وہ دونوں اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھتے ہیں۔

اس نافرمانی کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں جنت سے زمین پر اتار دیتے ہیں۔(Wheeler 2002, 15–35; Shafi 2008b, 159–187; Mikulicová 2014; Kaltner and Mirza 2018, 16–20)

اس واقعے کے حوالے سے قرآنِ مجید میں ایک ایسی آیت بھی ہے جس میں حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ کے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیے جانے کا ذکر خاص طور پر موجود ہے۔ یہ حوالہ اس تناظر میں آتا ہے جب ابلیس (شیطان) نے اللہ کے حکم کے باوجود حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا:

اللہ نے فرمایا: اے ابلیس! تجھے کس چیز نے روکا کہ تُو اُس کو سجدہ نہ کرے جسے میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے پیدا کیا؟ کیا تُو تکبر کر رہا ہے یا تُو بلند مرتبہ لوگوں میں سے ہے؟ (القرآن، 38:75)

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، بعض مفکرین اس آیت کو حضرت آدمؑ کی خصوصی تخلیق پر دلالت کے طور پر لیتے ہیں (Keller 2011, 350–364; Qadhi and Khan 2018)۔ یقینی طور پر، صرف "اللہ کے ہاتھوں" کا ذکر بذاتِ خود خصوصیت کی قطعی دلیل نہیں ہے، لیکن یہ بات اہم ہے کہ اس آیت میں اللہ کے "دو ہاتھوں" کا ذکر آیا ہے، بالمقابل واحد یا جمع کے۔ اور یہ انداز صرف حضرت آدمؑ کے لیے مخصوص ہے۔

کلاسیکی مفکرین جیسے ابن تیمیہ، البیہقی، اور بیضاوی اس بات پر متفق ہیں کہ یہ اسلوب آدمؑ کی تخلیق کی انفرادیت کو دیگر مخلوقات سے ممتاز کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے (Jalajel 2009, 150–152)۔ البتہ، اس انفرادیت کی حقیقی نوعیت کیا ہے، یہ امر واضح نہیں ہو سکا، اور اس نکتے پر باب 10 میں مزید گفتگو کی جائے گی۔ سورۃ آلِ عمران کی آیت 59 حضرت آدمؑ کے والدین کے امکان کو چیلنج کرتی ہے۔ اگرچہ یہ آیت بظاہر کسی اشکال کا باعث نہیں بنتی، تاہم اس کا سیاق و سباق اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی تخلیق ماں باپ کے بغیر ایک معجزانہ انداز میں ہوئی تھی۔ یہ آیت اس سورۃ میں واقع ہے جو مجموعی طور پر مسیحی عقائد، بالخصوص حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے تصور، پر تنقید کرتی ہے۔ سورہ آلِ عمران کے مختلف مقامات پر حضرت عیسیٰؑ کو خدائی درجہ دینے کی واضح تردید کی گئی ہے (Ayoub 1992)۔ مذکورہ آیت میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کے درمیان جس مشابہت کو بیان کیا گیا ہے، وہ یہی غیر معمولی اور معجزانہ تخلیق ہے (القرطبی 2019، 243–244)۔ جب اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: "کہا ہو جا، تو وہ ہو گیا"، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ فطری قوانین سے ماورا ہو کر بھی کسی چیز کو وجود میں لا سکتا ہے، اور یہ بات قرآن میں کئی مقامات پر آتی ہے۔ قرآن کے دوسرے مقام (سورہ مریم 19:16–21) میں حضرت مریمؑ کی معجزانہ حمل کی تفصیل بھی موجود ہے، جہاں جبرائیلؑ ان کو بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں، اور وہ حیرت سے جواب دیتی ہیں: "میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے، جب کہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں؟" (القرآن 19:20) چونکہ مسلمان حضرت مریمؑ کو سچا مانتے ہیں، اس لیے یہ آیت حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش پر ایک مضبوط دلیل سمجھی جاتی ہے۔ تاہم، اس کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ مکمل طور پر ایک جیسے ہیں۔ قرآن نے حضرت آدمؑ کے بارے میں خاص طور پر ذکر کیا ہے کہ اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا کیا اور پچھلی آیات

میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں۔ لہٰذا، ان تمام آیات کو یکجا کر کے دیکھا جائے تو حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کے درمیان بنیادی مشابہت یہ ہے کہ دونوں کے والد نہیں تھے۔ البتہ حضرت عیسیٰؑ کی ماں (حضرت مریمؑ) موجود تھیں، جبکہ حضرت آدمؑ کو ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا کیا گیا۔

مزید یہ کہ اس آیت کا ایک تاریخی پس منظر (اسبابِ نزول) بھی ہے۔ اس واقعے کی ایک روایت درج ذیل ہے۔

نجران سے دو راہب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے فرمایا: "اسلام قبول کرو۔" انہوں نے جواب دیا: "ہم تو آپ سے پہلے ہی اسلام قبول کر چکے ہیں۔" آپ ﷺ نے فرمایا: "تم جھوٹ کہتے ہو۔ تین چیزیں ہیں جو تمہیں اسلام قبول کرنے سے روکتی ہیں۔ تمہارا صلیب کے سامنے سجدہ کرنا، تمہارا یہ کہنا کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے، اور تمہارا شراب پینا۔" انہوں نے پوچھا: "آپ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟" نبی کریم ﷺ خاموش رہے، تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: "اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے (نیشاپوری 2010، 139)۔

اس واقعے کا مرکزی نکتہ رسول اللہ ﷺ اور کچھ عیسائی راہبوں کے درمیان ہونے والی گفتگو ہے۔ یہ راہب اسلام قبول نہیں کر رہے تھے، کیونکہ ان کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰؑ بغیر والد کے معجزانہ طور پر پیدا ہوئے، لہٰذا وہ ایک الٰہی ہستی ہیں۔ اسی پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی۔ اگر اس آیت کے تاریخی و موضوعی سیاق کو یکجا کیا جائے، تو اس میں حضرت عیسیٰؑ اور حضرت آدمؑ کے درمیان تقابلی استدلال پیش کیا گیا ہے، اور وہ کچھ یوں ہے: اگر عیسائی یہ دلیل دیتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ معجزانہ طور پر پیدا ہوئے اور اس وجہ سے وہ خدائی حیثیت رکھتے ہیں، تو پھر حضرت آدمؑ تو حضرت عیسیٰؑ سے بھی زیادہ معجزانہ طور پر پیدا کیے گئے، کیونکہ ان کے نہ ماں تھی نہ باپ۔ اسی وجہ سے اکثر مفسرین اور مسلم علماء نے اس آیت سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضرت آدمؑ کے ماں باپ نہیں تھے (Ayoub 1992, 183–188; Jalajel 2009, 48–52; Seoharvi 2009a, 316–317; Haleem 2011, 135; Nasr 2015, 147; Al-Qurṭubī 2019, 243–244)۔

ہم نے پہلے جن قرآنی آیات اور احادیث کا جائزہ لیا، وہ حضرت آدمؑ کی تخلیق کو عمومی انداز میں بیان کرتی ہیں، مثلاً: مٹی، گارا، یا انسانیت کے باپ کے طور پر، لیکن ان میں کسی جگہ صراحت کے ساتھ ماں باپ کی عدم موجودگی کا ذکر نہیں ملتا، جس کی وجہ سے انہیں مختلف زاویوں سے بھی سمجھا جا سکتا ہے، جیسے کہ: حضرت آدمؑ کی تخلیق جنت میں ہوئی، یا ان کے جسم کی مادی ترکیب کے حوالے سے گفتگو ہے۔ لیکن سورہ آلِ عمران کی یہ آیت اس پوری بحث کا مرکزی نکتہ معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ براہِ راست حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کے انکار کے لیے حضرت آدمؑ کی معجزانہ تخلیق کو بنیاد بناتی ہے، یعنی کہ حضرت آدمؑ کے ماں باپ نہیں تھے۔ اسی وجہ سے، اسلامی نقطۂ نظر اور نظریہ ارتقا کے مباحث میں یہ آیت غالباً سب سے اہم آیت شمار کی جا سکتی ہے۔

آخر میں، ایک اور حدیث کا ذکر ضروری ہے جو اس بحث سے متعلق ہے۔ یہ حدیث حضرت آدمؑ کے جسمانی وصف سے متعلق ہے، اور خاص طور پر ان کے قد کا ذکر کرتی ہے۔ اس حدیث میں بیان ہوا ہے کہ: "آدمؑ کا قد ساٹھ ہاتھ (تقریباً 30 میٹر) تھا" (بخاری 6277)۔ اگرچہ اس حدیث کا ارتقا (evolution) یا مشترک نسب (common descent) سے براہِ راست تعلق نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ موضوع اسلام اور ارتقا کی علمی گفتگو میں زیرِ بحث آیا ہے، اس لیے اس کا ذکر ضروری ہے (Mabud 1991, 91; Guessoum 2010, 829; Majid 2015, 104–105)۔

یہ حدیث ارتقا کی صداقت سے قطع نظر خود اپنے اندر بھی ایک مسئلہ رکھتی ہے، کیونکہ یہ فزکس اور حیاتیات جیسے سائنسی علوم سے متصادم ہے۔ یعنی انسانی جسم جس ساخت پر ہے، اس کے ساتھ اتنا طویل قد عملی طور پر ممکن نہیں (Zaman 2020)۔ یہ حدیث ایک اہم case study ہوگی، جب ہم باب 10 میں اس بات کا تنقیدی جائزہ لیں گے کہ مختلف علمی تجاویز اسلام اور ارتقاء میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے کیا طریقے اپناتی ہیں۔

مختصراً یہ کہ، جب ان تمام آیات اور احادیث کو ایک ساتھ دیکھا جائے، تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ مسلمان علماء نے عام طور پر حضرت آدمؑ کی معجزانہ تخلیق کو تسلیم کیا ہے اور یہ بھی مانا ہے کہ انسانیت کی نسل انہی سے شروع ہوئی۔ البتہ یہ تفصیلات کہ آدمؑ کی تخلیق کا عمل کیسے ہوا، اور اس کے بعد انسانوں کا زمین پر پھیلاؤ کن مراحل سے گزرا، یہ سب باتیں قرآن و حدیث میں مکمل وضاحت کے ساتھ بیان نہیں ہوئیں، جس پر ہم آئندہ ابواب میں مزید بات کریں گے۔ اسلامی تعلیمات کو ارتقا کے سائنسی نظریے کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کے لیے ایک ایسا تسلسل پر مبنی اور منظم تفسیری طریقہ کار درکار ہے، جس کے ذریعے ان آیات و احادیث کو کسی من مانی تعبیر یا وقتی تاویلات کے بغیر سمجھا جا سکے۔ ہم باب 4 میں یہ جائزہ لیں گے کہ مختلف مفکرین نے یہ توازن قائم کرنے کے لیے کیا کوششیں کی ہیں۔

عیسائی اور اسلامی بیانیوں میں کلیدی فرق

متعلقہ قرآنی آیات اور احادیث کا مختصر جائزہ لینے کے بعد، عیسائی اور اسلامی بیانیوں کے درمیان فرق کو واضح کرنے کا اب مناسب موقعہ ہے۔ باب 2 میں ہم نے ان چند حساس نکات کا ذکر کیا تھا جو بعض عیسائی مفکرین (خصوصاً Young-Earth Creationism - YEC کے پیروکاروں) کو ارتقا کے موضوع پر پریشان کرتے ہیں۔ جس میں اصل گناہ (Original Sin)، کائنات/زمین کی عمر، انبیائی نسب اور حضرت نوحؑ کا طوفان شامل ہیں۔ اب ہم ان نکات کا جائزہ اسی ترتیب سے لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اسلامی بیانیہ ان مسائل پر کس زاویے سے گفتگو کرتا ہے اور یہ ارتقا کے نظریے سے کس حد تک مطابقت رکھتا ہے۔

اصل گناہ (Original Sin)

باب دوم میں ہم نے یہ جانا کہ عیسائی بیانیے کے مطابق جب حضرت آدمؑ نے درخت کا پھل کھایا، تو اس سے پہلے دنیا نیکی اور خیر کی حالت میں تھی۔ لیکن جب انہوں نے نافرمانی کی اور جنت سے محروم ہوئے، تو شر، مصیبت اور موت دنیا میں وارد ہوئیں۔ یہی تصور "اصل گناہ" (Original Sin) کہلاتا ہے۔ تاہم، یہ نظریہ اسلامی بیانیے میں موجود نہیں ہے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا، تو ابلیس نے انکار کر دیا اور نافرمان ٹھہرا۔ اس نے اللہ کے ایک واضح حکم کو رد کر دیا۔ لہٰذا اسلام کے مطابق پہلا گناہ حضرت آدمؑ نے نہیں، ابلیس نے کیا۔ ایک اور نکتہ جو اس فرق کو مزید واضح کرتا ہے وہ فرشتوں کا سوال ہے جو حضرت آدمؑ کی تخلیق کے وقت انہوں نے اللہ تعالیٰ سے کیا: "کیا تو زمین میں ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو فساد کرے گا اور خون بہائے گا، حالانکہ ہم تیری حمد و ثنا کرتے ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہیں؟" (القرآن 2:30) یہ سوال خود ایک دلچسپ پہلو رکھتا ہے کہ فرشتوں نے یہ سوال کیوں کیا؟ کچھ روایات کے مطابق،

یہ سوال ان مخلوقات کے پس منظر میں کیا گیا جو حضرت آدمؑ سے پہلے زمین پر موجود تھیں اور جنہوں نے فساد اور خونریزی کی تھی۔ بعض مفسرین کے مطابق یہ مخلوق ابلیس اور اس کے ساتھی تھے، جو حضرت انسان سے پہلے زمین پر بستے تھے۔ دوسروں کے نزدیک یہ ماقبلِ آدمی مخلوقات (pre-Adamic entities) تھیں، شاید وہ نیم انسانی (pseudo-human) مخلوقات ہوں۔ جبکہ بعض کہتے ہیں کہ یہ صرف فرشتوں کی فطری جستجو تھی، جس کا جواب اللہ تعالیٰ نے انہیں آگے چل کر دیا (ایوب 1984، ص 71–92؛ ندوی 1998، ص 29–74؛ نصر 2015، ص 21–22؛ البیضاوی 2016؛ القرطبی 2018، ص 117–118)۔

حقیقت جو بھی ہو، یہ بات واضح ہے کہ اسلامی بیانیہ آدم کے درخت کھانے کو دنیا میں شر و فساد کی ابتدا قرار نہیں دیتا۔ یقیناً، دونوں مذاہب اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کو جنت سے نکالا گیا، لیکن "اصل گناہ" کا تصور ایک بنیادی الہیاتی فرق ہے جس پر اسلام اور عیسائیت الگ الگ موقف رکھتے ہیں (Ayoub 1984, 71–92; Burrel 2011; Khalil 2012; Winter 2017)۔

کائنات / زمین کی عمر

Young-Earth Creationism (YEC) کے لیے کائنات اور زمین کی عمر ایک اہم اختلافی نکتہ ہے۔ YEC کے پیروکاروں کا ماننا ہے کہ بائبل کو لفظ بہ لفظ (literal) طور پر لیا جائے، جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ زمین کی عمر صرف 6,000 سے 10,000 سال ہے۔ وہ اس تعبیر کو کسی اور معنوی یا تمثیلی زاویے سے سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ جبکہ قرآن مجید میں بعض آیات میں آسمان و زمین کی تخلیق چھ دنوں میں ہونے کا ذکر ضرور آیا ہے، لیکن یہاں دن

کے لیے استعمال ہونے والا لفظ "یوم" لغوی طور پر مختلف ادوار اور مدتوں پر دلالت کرتا ہے۔ یعنی "یوم" صرف 24 گھنٹے کا دن نہیں، بلکہ یہ کسی بھی دورانیہ یا وقت کے وقفے کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔ اسی لسانی لچک (semantic flexibility) کی وجہ سے اسلامی متون قدیم کائنات یا اربوں سال پرانی زمین کے تصور سے کسی قسم کا تصادم نہیں رکھتے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ اسلامی دنیا میں YEC جیسا سخت موقف شاذ و نادر ہی پایا جاتا ہے (اگرچہ یہ بات احتیاط کے ساتھ بیان کی جانی چاہیے)۔

نسبِ نبوی (Prophetic Lineage)

کائنات کی عمر سے متعلق بحث میں انبیا کے نسب (genealogy) کا بھی اہم کردار ہے، جیسا کہ ہم نے باب 2 میں دیکھا تھا۔ YEC کے پیروکاروں کا ماننا ہے کہ تمام انبیا کا سلسلہ نسب حضرت آدمؑ تک جا پہنچتا ہے، جنہیں وہ زمین پر اُس وقت آنے والا پہلا انسان مانتے ہیں جب زمین ابھی نئی نئی وجود میں آئی تھی۔ اسلامی متون میں بلاشبہ انبیا کا ذکر موجود ہے، کچھ انبیا کا تفصیلی ذکر ہے، کچھ کا اجمالی۔ لیکن قرآن مجید انبیا کے نسب اور ان کی تاریخی ترتیب کے بارے میں بہت محدود معلومات فراہم کرتا ہے۔ چند احادیث میں نبی کریم ﷺ اور ان سے پہلے عرب قبائل کا نسب ضرور بیان ہوا ہے، کیونکہ یہ عرب ثقافت میں اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن جب نسب کا سلسلہ حضرت نوحؑ سے آگے حضرت آدمؑ تک لے جایا جاتا ہے تو اس کی تاریخی صحت کمزور ہو جاتی ہے (Jalajel 2009, 54، ابن کثیر 2010، ص 34)۔ اسلامی روایت اور بائبل بعض درمیانی شخصیات پر متفق ہو سکتے ہیں، لیکن ایسا کوئی مستند و متفقہ مآخذ موجود نہیں جس پر مسلمان یہ یقین رکھیں کہ وہ نسبی سلسلہ حضرت آدمؑ تک درست طور پر پہنچتا ہے (Varisco 1995)۔

طوفانِ نوحؑ

بائبل سے جُڑی حساسیتوں میں ایک اہم مسئلہ حضرت نوحؑ کا طوفان بھی تھا۔ قرآنِ مجید میں بھی حضرت نوحؑ کا ذکر متعدّد مقامات پر آیا ہے، اور مجموعی خاکہ بائبل سے مماثلت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت نوحؑ کو حکم دیتے ہیں کہ وہ ایک کشتی بنائیں اور اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچائیں۔ کچھ لوگ ایمان لے آتے ہیں، لیکن اکثریت انکار کر دیتی ہے۔ اللہ نوحؑ کو یہ بھی ہدایت دیتے ہیں کہ وہ ہر قسم کے جانوروں کا ایک جوڑا کشتی میں سوار کریں (Wheeler 2002, 49–62; Kaltner and Mirza 2018, 36–140)۔ لیکن ارتقا سے متعلق بحث کے تناظر میں اہم نکتہ یہ ہے کہ آیا یہ طوفان مقامی تھا یا عالمی؟ باب 2 میں ہم نے دیکھا تھا کہ عیسائی مفکرین اس مسئلے پر مختلف آرا رکھتے ہیں۔ اسلامی متون میں اس بارے میں کوئی قطعی اور حتمی بیان موجود نہیں۔

مفسرین میں بھی اس پر اختلاف پایا جاتا ہے: کچھ اسے مقامی طوفان قرار دیتے ہیں، جبکہ کچھ عالمی طوفان کے قائل ہیں (Seoharvi 2009b, 70)۔ لیکن جیسا کہ ابن عطیہ (2002، ص 946) نے واضح کیا ہے، قرآن یا حدیث میں

اس مسئلے پر کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا گیا۔ اسی لیے، اسلامی متون کی تعبیر مقامی اور عالمی دونوں امکانات کے ساتھ مطابقت رکھتی ہے۔

خلاصہ

اس باب میں ارتقا سے متعلق اسلامی تعلیمات اور قرآن و حدیث کے بیانات کا جائزہ لیا گیا، جنہیں مجموعی طور پر تین تخلیقی مراحل میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: پہلا، کائنات اور زمین کی تخلیق، جس کے بارے میں قرآن میں چھ دن کا ذکر تو ہے، مگر ان دنوں کی مدت یا نوعیت کے بارے میں کوئی وضاحت نہیں، یوں قرآن کی زبان سائنسی نظریے سے متصادم نظر نہیں آتی۔ دوسرا مرحلہ غیر انسانی زندگی کی تخلیق کا ہے، جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ زندگی کا آغاز پانی سے ہوا، مگر یہ بیان نہیں کیا گیا کہ پودوں اور جانوروں کی تخلیق کا عمل کیسے وقوع پذیر ہوا، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں بھی کوئی سائنسی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ تیسرا اور سب سے اہم مرحلہ حضرت آدمؑ کی تخلیق کا ہے، جسے قرآن و حدیث میں ایک خاص اور معجزانہ واقعہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے؛ انہیں انسانیت کا باپ قرار دیا گیا ہے اور انسانوں کو ان کی اولاد کہا گیا ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انسانی نسب حضرت آدمؑ تک جا پہنچتا ہے۔ اگر اسلامی تعلیمات کو ارتقا کے نظریے کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہے تو ضروری ہے کہ ان نصوص کی تفہیم ایک مربوط، منضبط اور غیر جانب دار طریقے سے کی جائے، تاکہ اس میں کسی بھی قسم کی من چاہی تاویلات یا زبردستی کے معانی شامل نہ کیے جائیں۔ اس کے ساتھ بائبل اور قرآن کے بیانیے کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا گیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں "اصل گناہ" (Original Sin) کا کوئی تصور نہیں، بلکہ حضرت آدمؑ اور حواؑ کی لغزش کو ذاتی عمل کے طور پر بیان کیا گیا ہے، نہ کہ پوری انسانیت کے لیے اخلاقی گناہ کی بنیاد کے طور پر۔ اسی طرح کائنات کی عمر، انبیا کی نسلوں کا تسلسل، اور طوفان نوحؑ کے بارے میں بھی قرآن کوئی ایسا قطعی بیان نہیں دیتا جو سائنسی دریافتوں سے متصادم ہو۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلام، جب تک اسے تنگ نظری یا انتہا پسندی سے نہ سمجھا جائے، ارتقا جیسے سائنسی نظریات کے ساتھ کسی ٹکراؤ کا سبب نہیں بنتا، بشرطیکہ اس کے متون کی تعبیر میں علمی دیانت اور توازن اختیار کیا جائے۔

حوالہ جات

1. Abdul-Jabbar, Ghassan. 2020a. “The Classical Tradition.” In Daniel W Brown, ed. The Wiley Blackwell Concise Companion to the Ḥadīth. West Sussex: Wiley Blackwell, 15–38.

2. Abdul-Jabbar, Ghassan. 2020b. “Collections.” In Daniel W Brown, ed. The Wiley Blackwell Concise Companion to the Ḥadīth. West Sussex: Wiley Blackwell, 137–158.

3. Al-Arnaʾūṭ, Shoʿayb, and ʿĀdil Murshid, eds. 2001. Musnad al-Imām Aḥmad Ibn Ḥanbal. Volume 38. Beirut: Muʾassasat al-Risāla.

4. Al-Bayḍāwī, ʿAbdullah Ibn ʿUmar. 2016. The Lights of Revelation and the Secrets of Interpretation: Hizb One of the Commentary on the Qurʾān. trans. by Gibril Fouad Haddad. Manchester: Beacon Books.

5. Al-Gharnāṭī, Abū Ḥayyān Athīr ad-Dīn, 2002a. "Tafsīr al-Baḥr al-Muḥīṭ." Al-Tafāsīr. Accessed 15th of June 2025. Available at: https://www.altafsir.com/Tafasir.asp?tMadhNo=0&tTafsirNo=19&tSoraNo=3&tAyahNo=59&tDisplay=yes&Page=%2010&Size=1&LanguageId=1.

6. Al-Qurṭubi, Abū ʿAbdullah Muhammad. 2018. Tafsīr al-Qurṭubi. Volume 1. trans. by Aisha Bewley. Bradford: Diwan Press.

7. Al-Qurṭubī, Abū ʿAbdullah Muhammad. 2019. Tafsīr al-Qurṭubī. Volume 2. trans. by Aisha Bewley. Bradford: Diwan Press.

8. Al-Rāzī, Muḥammad Ibn ʿUmar (Fakhr al-Dīn). 2000. Mafātīḥ al-Ghayb. Volume 9. Beirut: Dār al-Kutub al-ʿIlmiyya.

9. An-Naisaburi, Abdul Hassan. 2010. Reasons of Revelation of the Noble Qurʾān. trans. by Aiman Saleh Sha'aban and Muhammad Ismail. Selangor Darul Ehsan: Dakwah Corner Bookstore. Ayoub, Mahmoud M. 1984. The Qurʾān and Its Interpreters. Volume 1. New York, NY: The State University of New York Press.

10. Ayoub, Mahmoud M. 1992. The Qurʾān and Its Interpreters. Volume 2. New York, NY: The State University of New York Press.

11. Brown, Raymond E. 1973. The Virginal Conception and Bodily Resurrection of Jesus. New York, NY: Paulist Press.

12. Brown, Raymond E. 1993. The Birth of the Messiah: A Commentary on the Infancy Narratives in the Gospels of Matthew and Luke. New York, NY: Doubleday.

13. Brown, Jonathon A. C. 2009. Hadīth: Muhammad's Legacy in the Medieval and Modern World. New York, NY: Oneworld Publications.

14. Burrel, David B. Towards a Jewish-Christian-Muslim Theology. West Sussex: Wiley-Blackwell.

15. Graham, William A. 2020. "Revelation." In Daniel W Brown, ed. The Wiley Blackwell Concise Companion to the Ḥadīth. West Sussex: Wiley Blackwell, 59–74.

16. Görke, Andreas. 2020. "Muhammad." In Daniel W. Brown, ed. The Wiley Blackwell Concise Companion to the Ḥadīth. West Sussex: Wiley Blackwell, 75–90.

17. Guessoum, Nidhal. 2010. “Religion Literalism and Science-Related Issues in Contemporary Islam.” Zygon, 45(4): 817–840.

18. Haleem, Muhammad Abdel. 2011. Understanding the Qurʾān: Themes and Style. London: I.B. Tauris.

19. Ibn al-Jawzī, ʿAbdur Rahmān. 2002. Zād al-Masīr fī ʿIlm al-Tafsīr. Beirut: Dār Ibn Ḥazm.

20. Ibn ʿAṭiyya, ʿAbd al-Ḥaqq. 2002. Al-Muḥarrar al-Wajīz fī Tafsīr al-Kitāb al-Azīz. Beirut: Dār Ibn Ḥazm.

21. Ibn Kathīr, Abū l-Fidāʾ Ismāʿīl Ibn ʿ Umar. 2010. The Life of Prophet Muhammad. Trans. by Rafiq Abdur Rehman. Karachi: Darul-Ishaat.

22. Jalajel, David Solomon. 2009. Islam and Biological Evolution: Exploring Classical Sources and Methodologies. Western Cape: University of the Western Cape.

23. Kaltner, John, and Younus Mirza. 2018. The Bible and the Qurʾān: Biblical Figures in the Islamic Tradition. London: Bloomsbury.

24. Keller, Nuh Ha Mim. 2011. Sea Without Shore: A Manual of the Sufi Path. Amman: Sunna Books.

25. Khalil, Mohammad Hassan. 2012. Islam and the Fate of Others. Oxford: Oxford University Press.

26. Mabud, Shaik Abdul. 1991. Theory of Evolution: An Assessment from the Islamic Point of View. Cambridge: The Islamic Academy.

27. Majid, DS Adnan. 2015. “Qurʾānic Interpretative Latitude and Human Evolution: A Case Study.” Al-Bayan – Journal of Qurʾān and Ḥadīth Studies, 12: 95–114.

28. Michot, Yahya. 2009. “Revelation.” In Tim Winter, ed. The Cambridge Companion to Classical Islamic Theology. Cambridge: Cambridge University Press, 180–196.

29. Mikulicová, Mlada. 2014. “Adam’s Story in the Qurʾān.” Theologica, 4(2): 277–296.

30. Nadvi, Khurshid. 1993. Darwinism on Trial. London: Ta-Ha Publishers.

31. ندوی، محمد شہاب الدین۔ 1998۔ تخلیقِ آدم اور نظریہ ارتقا۔ بنگلور: فرقانی اکیڈمی ٹرسٹ۔

32. Seyyed Hossein. ed. 2015. The Study Qurʾān: A New Translation and Commentary. New York, NY: Harper One.

33. Qadhi, Yasir, and Nazir Khan. 2018. “Human Origins: Theological Conclusions and Empirical Limitations.” Yaqeen Institute. Accessed 15th of June 2025. Available at: https://yaqeeninstitute.org/read/paper/human-origins-part-1-theological-conclusions-and-empirical-limitations

34. Seoharvi, Muhammad Hifzur Rehman. 2009a. Stories from the Qurʾān. Volume 2. trans. by Rafiq Abdur Rahman and Muhammad Saeed. Karachi: Darul-Ishaat.

35. Seoharvi, Muhammad Hifzur Rehman. 2009b. Stories from the Qurʾān. Volume 1. trans. by Rafiq Abdur Rahman and Muhammad Saeed. Karachi: Darul-Ishaat.

36. Shafi, Muhammad. 2008a. Ma'ariful Qurʾān: A Comprehensive Commentary on the Holy Qurʾān. Volume 7. trans. by Muhammad Taqi Usmani. Karachi: Maktaba-e-Darul-Uloom.

37. Shafi, Muhammad. 2008b. Ma'ariful Qurʾān: A Comprehensive Commentary on the Holy Qurʾān. Volume 1. trans. by Muhammad Taqi Usmani. Karachi: Maktaba-e-Darul-Uloom.

38. Totolli, Robert. 2020. "Genres." In Daniel W. Brown, ed. The Wiley Blackwell Concise Companion to the Ḥadīth. West Sussex: Wiley Blackwell, 187–202.

39. Varisco, Daniel Martin. 1995. "Metaphors and Sacred History: The Genealogy of Muhammad and the Arab 'Tribe.' Anthropological Quarterly, 68(3): 139–156.

40. Wheeler, Brannon M. 2002. Prophets in the Qurʾān: An Introduction to the Qurʾān and Muslim Exegesis. New York, NY: Continuum.

41. Wilkinson, David. 2017. Science, Religion, and the Search for Extraterrestrial Intelligence. Oxford: Oxford University Press.

42. Winter, Timothy. 2017. "Islam and the Problem of Evil." In Chad Meister, and Paul K Moser, eds. The Cambridge Companion to the Problem of Evil. Cambridge: Cambridge University Press, 230–248.

43. Zaman, Muntasir. 2020. At the Crossroads of Science and Scripture: An Analysis of the Ḥadīth on Prophet Adam's Height (Unpublished manuscript).

(جاری)

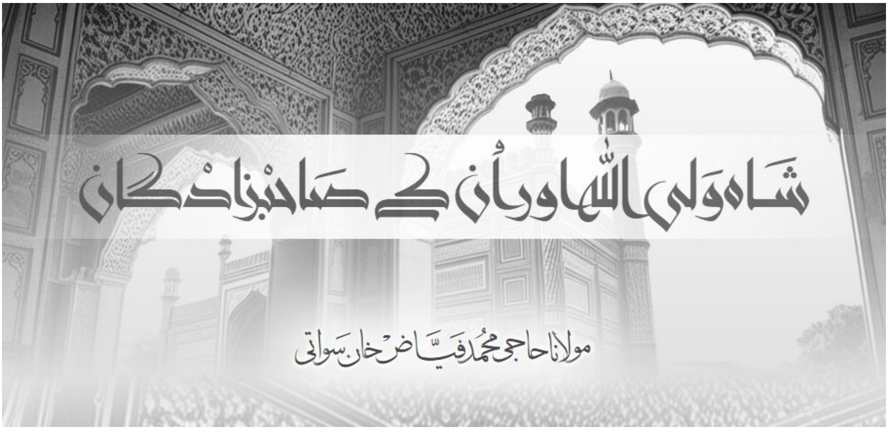

سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ

نام ونسب

آپ کا نام عبد العزیز ہے اور تاریخی نام غلام حلیم تھا۔ سلسلہ نسب یوں ہے۔ عبد العزیز بن احمد (المعروف شاہ ولی اللہؒ) بن عبد الرحیم بن وجیہہ الدین شہید بن معظم بن منصور دہلوی ...... الخ۔ آپ کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے اکتیس واسطوں سے امیر المؤمنین خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ تک پہنچتا ہے اور والدہ کی طرف سے آپ کا سلسلہ نسب امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے۔ (الامداد فی ماثر الاجداد)

ولادت

شاہ صاحبؒ کی ولادت باسعادت ۲۲ رمضان ۱۱۵۹ھ بمطابق ۱۷۴۶ء کو دہلی میں ہوئی۔

ابتدائی تعلیم

شاہ صاحبؒ نے سب سے پہلے قرآن کریم حفظ کیا پھر اکثر درسی کتابیں اپنے والد گرامی امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ سے پڑھیں۔ جب آپ کی عمر سولہ سال کی ہوئی تو آپ کے والد کا محرم ۱۱۷۶ھ بمطابق ۱۷۶۲ء کو انتقال ہوگیا۔ والد کی وفات کے بعد جو کتابیں پڑھنے والی رہ گئی تھیں وہ مولانا نور اللہ بڈھانویؒ، شیخ محمد امین کشمیریؒ اور شیخ محمد عاشق پھلتیؒ کے حلقہ ہائے درس میں شامل ہو کر مکمل کیں اور سترہ سال کی عمر میں تحصیل علم سے فراغت حاصل کر کے اپنے والد کی مسند درس کو رونق بخشی۔

آپ کو تفسیر، حدیث، فقہ، ادبیات عربی، صرف ونحو، منطق وفلسفہ وغیرہ علوم میں انتہائی دسترس تھی۔ خط بھی نہایت عمدہ تھا، تیر اندازی اور گھڑ سواری میں بھی ماہر تھے، ذکاوت وفطانت میں یگانہ، فہم وفراست میں منفرد، حفظ و ذہانت میں بے مثل تھے، اس لیے مسند درس پر بیٹھتے ہی ان کی شہرت پورے ملک میں پھیل گئی اور دور دراز علاقوں سے علماء وطلباء استفادہ کے لیے حاضر خدمت ہونے لگے۔

اخلاق وعادات

شاہ صاحبؒ کو علماء سراج الہند، شیخ وقت، امام عصر، عالم کبیر اور حجۃ اللہ جیسے پر شکوہ القاب سے مقلب کرتے تھے۔ آپ امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے سب سے بڑے فرزند ارجمند اور حضرت شاہ عبد الرحیمؒ کے پوتے ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے عالم طفولیت سے ہی ایک اونچے ماحول میں تربیت پائی تھی، آپ کا خاندان بھی نہایت بلند مرتبت اور علمی تھا، یہی وجہ ہے کہ آپ عادات واطوار، اخلاق وکردار اور مزاج کے لحاظ سے ایک ممتاز اور منفرد مقام رکھتے تھے۔ امراء کی محفلوں اور رؤساء کی مجلسوں سے انہیں شدید نفرت تھی، اس کے برعکس غرباء ومساکین، یتامیٰ وطلباء علم سے نہایت الفت و محبت کا برتاؤ کرتے تھے۔ مریضوں کی عیادت، بیواؤں کی امداد، مہمانوں کی تواضع اور مسافروں کی خاطرداری آپ کا محبوب ترین مشغلہ تھا، ہر شخص سے خوش اخلاقی اور عجز وانکساری سے پیش آتے تھے، آپ تقویٰ وللّٰہیت کا پیکر حسین تھے۔

اولاد

شاہ صاحبؒ کی نرینہ اولاد نہیں تھی صرف تین بیٹیاں تھیں، ایک کی شادی حضرت شاہ رفیع الدینؒ کے صاحبزادے مولانا محمد عیسیٰؒ سے ہوئی، دوسری کی شادی شیخ محمد افضلؒ کے ساتھ ہوئی جن سے شاہ محمد اسحٰق دہلویؒ اور شاہ محمد یعقوبؒ پیدا ہوئے، تیسری لڑکی کا نکاح مولانا عبد الحی بڈھانویؒ سے ہوا جن سے مولانا عبد القیوم بھوپالیؒ پیدا ہوئے۔ (اتحاف النبلاء ص ۱۳۶)

شاہ صاحبؒ کی خصوصیات

شاہ صاحبؒ بہت سے اوصاف سے مالامال تھے، وہ جہاں علوم عربی میں ممتاز تھے وہاں بہت سی دیگر زبانوں پر بھی عبور رکھتے تھے، عربی اور فارسی میں تو انہیں مہارت تامہ تھی ہی، اردو اور عبرانی میں بھی انہیں آگاہی حاصل تھی۔ شاہ صاحبؒ اردو زبان کی تعلیم کے لیے خواجہ میر درد کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے جس کی بدولت انہوں نے اس زبان پر بھی عبور حاصل کر لیا تھا۔ شاہ صاحبؒ کو یوں تو تمام علوم وفنون مروجہ پر مکمل دسترس حاصل تھی لیکن قرآن حکیم اور حدیث رسولؐ سے انھیں بالخصوص انتہائی شغف اور غایت درجہ کا تعلق تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ حدیث نبویؐ کی ترویج واشاعت اور تبلیغ وتدریس میں صرف کیا۔

قوت حافظہ

شاہ صاحبؒ جن خوبیوں اور کمالات سے مالا مال تھے ان میں ایک بہت بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ ان کی قوت حافظہ نہایت تیز تھی اور یادداشتوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ان کے نہاں خانہ ذہن میں محفوظ تھا، ان کو بہت سی ایسی باتیں یاد تھیں جن کا تعلق ان کی عمر کے بالکل ابتدائی دور اور عہد طفلی سے تھا، اس کا ثبوت ان کے ملفوظات سے ملتا ہے۔ (ملفوظات ص ۶۸)

مقرر

شاہ صاحبؒ جہاں اقلیم علم میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے وہاں تقریر و خطابت اور انداز وعظ و نصیحت میں بھی ان کا کوئی حریف نہ تھا۔

طلبہ کے ساتھ شفقت

علوم کے متلاشی طلباء کے ساتھ ان کا برتاؤ ہمیشہ مشفقانہ رہا، ان کی ضروریات کی کفالت کرتے اور بہت ہی الفت و محبت سے پیش آتے، ان کے سوالات کا دلائل و براہین سے جواب دیتے جس سے ان کے تمام شکوک و شبہات دور ہو جاتے تھے، شاہ صاحبؒ میں عالمانہ غرور بالکل نہ تھا، نفرت و تکبر سے نفور تھے۔

مناظر

شاہ صاحبؒ کو اللہ تعالیٰ نے حاضر جوابی کا ملکہ عطا فرمایا تھا جس کی بناء پر انہوں نے ہندوستان میں عیسائی پادریوں سے کئی مناظرے اور مباحثے کیے اور عیسائی پادریوں کو منہ توڑ جوابات سے پسپا کر دیا۔

فرنگی کے خلاف فتویٰ

شاہ صاحبؒ کا زمانہ سیاسی اعتبار سے نہایت پر آشوب تھا، مغل حکومت دم توڑ رہی تھی اور انگریز پورے ملک پر قبضہ جما رہے تھے۔ ان حالات میں شاہ صاحبؒ نے ایک طرف تو درس و تدریس کے ذریعے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ جیسے نامور مجاہد پیدا کیے جنہوں نے اپنی زندگیاں برصغیر سے انگریزی اقتدار کو ختم کرنے اور اسلامی نظام حکومت قائم کرنے کے لیے وقف کر دیں۔ دوسری طرف تحریر کا سلسلہ شروع کیا جو نہایت مضبوط اور ہمیشہ رہنے والا ہے اس سے لوگ ہر دور میں مستفید ہوتے رہیں گے۔

ان کی تحریرات میں ایک نہایت شاندار فتویٰ بھی ہے جو انہوں نے انگریز کے خلاف جاری کیا جس میں عیسائی افسروں کے احکام کا ہندوستان میں بے دھڑک جاری ہونے کا ذکر ہے۔ شاہ صاحبؒ کے اس فتوے اور ان کی انگریز دشمنی کا یہ نتیجہ نکلا کہ مجاہدین کی ایک زبردست جماعت تیار ہو گئی جس نے انگریز کے خلاف باقاعدہ جہاد کیا۔ جہاد کے لیے جو لوگ عملاً

میدان میں نکلے ان میں شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقاء تھے، ان حضرات کی مساعی جمیلہ نے اس قدر وسعت اختیار کی کہ آزادی برصغیر تک یہ سلسلہ جاری رہا۔

شاہ صاحبؒ نے انگریزی حکومت کی ملازمت کو گناہ کبیرہ اور حرام بلکہ کفر قرار دیا جس کی پاداش میں انہیں شدید اذیتوں اور مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا۔ شاہ صاحبؒ کو حق گوئی اور بے باکی کی وجہ سے ان کے بھائی شاہ رفیع الدینؒ اور تمام اہل و عیال سمیت نجف عالی خاں جو کہ متعصب شیعہ اور مغل حکومت میں منصب دار تھا اور دہلی پر اس کا تسلط تھا، اس نے دہلی سے نکل جانے کا حکم دیا اور تمام اہل و عیال کو شہر بدر کر دیا۔ شاہ صاحبؒ اس وقت بیمار تھے اور چلنے پھرنے کی ہمت نہ رکھتے تھے اس کے باوجود انہیں اور ان کے بھائی کو خاص طور پر یہ حکم جاری کیا کہ وہ پیدل اور ننگے پاؤں سفر کریں۔ سخت گرمی کے دن، چلچلاتی دھوپ، بیماری کا عالم، اس پر مزید یہ ظلم کہ دونوں بھائیوں کو پیدل اور برہنہ پا چلنے کا حکم دیا گیا۔ دہلی سے جون پور تک کی طویل مسافت انتہائی تکلیف اور صعوبت سے طے کی، راستے میں ایسی ایسی اذیتوں سے دوچار ہونا پڑا کہ شاہ عبد العزیزؒ کی بینائی بھی جاتی رہی اور کئی قسم کی بیماریاں بھی لاحق ہو گئیں۔

جلاوطنی کی مدت پوری کر کے دہلی واپس آئے تو شہر پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ عملاً ریزیڈنٹ (resident) کی حکومت تھی اور مغل بادشاہ اثر و اقتدار سے تقریباً محروم ہو چکا تھا، ملک کی اکثر ریاستیں انگریزی اقتدار کے سامنے جھک گئی تھیں اور ان کے حکمرانوں نے چاپلوسی کو شعار بنا لیا تھا اور اسی کو بقاء اور حفاظت کا اصل ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔ شاہ صاحبؒ اس صورت حال سے انتہائی پریشان اور آزردہ خاطر ہوئے اور فتویٰ جاری کیا کہ ہندوستان دار الحرب ہو گیا ہے کیونکہ یہاں شعائر اسلام کی بے حرمتی کی جا رہی ہے اور عیسائی حکومت کے احکام جاری اور نافذ ہیں۔ اس فتوے کا لوگوں پر بڑا اثر پڑا آگے چل کر انگریزی حکومت کے خلاف مستقل جہاد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور مجاہدین کی جماعت نے وہ نمایاں کارنامے انجام دیئے جو برصغیر کی تاریخ حریت کا ایک زریں باب بن گئے۔

تصانیف

شاہ صاحبؒ متعدد علمی اور تحقیقی کتابوں کے مصنف ہیں جن سے لوگ قیامت تک استفادہ کرتے رہیں گے۔

۱۔ تفسیر فتح العزیز

جو کہ تفسیر عزیزی کے نام سے مشہور ہے، فارسی میں ہے اور سوا تین پاروں پر مشتمل ہے۔ سورۃ فاتحہ سے پارہ دوم کے ربع تک اور پارہ نمبر ۲۹ اور نمبر ۳۰ کی تفسیر۔ یہ تفسیر شاہ صاحبؒ کی آخری عمر کی تصنیف ہے جب کہ ان کی قوت بصارت باقی نہیں رہی تھی، اپنے ایک شاگرد کو بٹھا کر املاء کرواتے تھے، یہ اپنی نوعیت کی ایک منفرد تفسیر ہے۔ مولانا عبد الحی حسنی لکھویؒ لکھتے ہیں کہ یہ تفسیر کئی بڑی بڑی جلدوں پر مشتمل تھی لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گئی اور پہلی اور آخری صرف دو جلدیں باقی رہ گئیں۔ (نزہۃ الخواطر ص ۲۷۳ ج ۷)

نوٹ: شاہ صاحبؒ کے شاگرد مولوی امام الدین صاحب کے ہاتھ سے املائی تقریر تفسیر عزیزی کے تقریباً سوا پانچ پارے (سورۃ مومنون تا سورۃ یٰسین مکمل) ہمیں کسی کتب خانہ سے ملے ہیں جو کہ ہمارے پاس محفوظ ہیں اور اسے شائع کرنے کا ارادہ بھی ہے۔

۲-عجالہ نافعہ

یہ کتاب بھی فارسی میں ہے اور اس میں علم اصول حدیث کے مختصر مگر جامع قوانین ہیں۔

۳۔بستان المحدثین

یہ کتاب بھی فارسی میں ہے، اس میں محدثین کے حالات و کوائف کا احاطہ کیا گیا ہے، یہ اپنے موضوع پر بڑی سیر حاصل کتاب ہے، بارہویں صدی کے بعد اس موضوع سے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں یہ ان سب کا ماخذ ہے۔

۴۔ سر الشہادتین

یہ کتاب عربی میں ہے اور حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے حالات میں ہے، اس کا اردو ترجمہ شاہ صاحبؒ کے شاگرد مولانا خرم علی بلہوریؒ نے کیا اور ان کے دوسرے شاگرد مولوی سلامت اللہ کشفیؒ نے "تحریر الشہادتین" کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے۔

۵۔ عزیز الاقتباس فی فضائل اخیار الناس

یہ کتاب بھی عربی میں ہے، اس میں حضرات خلفائے راشدینؓ کے حالات بڑے محققانہ انداز میں لکھے ہیں، یہ بھی اپنی نوعیت کی ایک بہترین تصنیف ہے۔

۶۔ شرح میزان المنطق

یہ عربی کے اندر ایک مختصر رسالہ ہے جو میزان المنطق کی شرح ہے۔

۷۔ شرح میزان العقائد

۸-التقریر فی حل بحث المثناۃ بالتکریر (صدرا)

۹۔ سر الجلیل فی مسئلۃ التفضیل

۱۰۔ وسیلۃ النجات

۱۱۔ حواشی بدیع المیزان

یہ بھی عربی کے اندر ہے اور بدیع المیزان کی ایسی عمدہ شرح ہے کہ اس کے مطالعہ سے منطق کے مسائل کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

۱۲۔ فتاویٰ عزیزی

یہ کتاب فارسی میں ہے اور دو جلدوں پر مشتمل ہے، مختلف عنوانات کے بہت سے فتووں کو نہایت عمدگی کے ساتھ اپنے دامن صفحات میں لیے ہوئے ہے۔

۱۳۔ تحفہ اثناء عشریہ

یہ کتاب بھی فارسی میں ہے اور شاہ صاحبؒ کی یہ بہت ہی اہم تصنیف ہے، شیعہ کے رد میں ہے اور بارہ ابواب پر مشتمل ہے، اپنے موضوع کے لحاظ سے یہ ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے، یہ اس قدر جامع اور مبسوط کتاب ہے کہ اسے شیعہ اور اہل سنت کے مسائل و عقائد کا دائرۃ المعارف کہنا بے جا نہ ہوگا۔ یہ کتاب چونکہ بڑی جاندار اور معلومات افزا تھی اس لیے شیعہ حلقوں میں اس سے ایک تہلکہ بپا ہوگیا اور متعدّد نامور شیعوں نے اس کا جواب دینے اور اس کا اثر زائل کرنے کی متعدّد ناکام کوششیں کی ہیں۔

۱۴۔ میزان البلاغۃ

یہ بھی عربی کے اندر ایک مختصر مگر جامع رسالہ ہے، اس میں علم بلاغت کے اصولی قواعد بڑے احسن پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مبتدیوں کے لیے یہ گراں قدر خزانہ ہے جس پر حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحبؒ سابق مفتی دار العلوم دیوبند کا حاشیہ ہے۔ یہ رسالہ کافی مدت سے نایاب تھا اسے ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے شائع کرنے کی نعمت عظمٰی حاصل کی ہے اور اپنے روایتی مشن کے مطابق قارئین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

شاہ صاحبؒ کا مسلک

شاہ صاحبؒ اپنے والد شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے صحیح جانشین ہوئے، اپنے والد کے علوم کو جس انداز میں انہوں نے سمجھا اور آگے اس کی نشر و اشاعت کی، ان کے افکار کو اپنایا اور اسے رواج دینے کی کوشش کی، تقریباً ساٹھ سال تک درس حدیث دیا، یہ سب قابل ستائش و آفرین ہے۔ شاہ ولی اللہؒ تو مجتہد منتسب کے درجہ پر فائز تھے لیکن عملاً حنفی المسلک تھے مگر شاہ عبد العزیز صاحبؒ راسخ العقیدہ حنفی مسلک پر کاربند تھے اور اسی کی تبلیغ کرتے تھے۔

شاگرد

شاہ صاحبؒ کے ہزاروں شاگردوں میں سے مندرجہ ذیل چند حضرات کے نام درج ہیں جن میں سے ہر بزرگ علم و فضل میں یکتا تھا اور ہر ایک نے تحقیق و کاوش کے مختلف میدانوں میں جو کارنامے انجام دیئے وہ تذکرہ کی کتابوں میں محفوظ ہیں، شاگردوں کے مقام و مرتبے کی رفعت سے استاد کی عظمت کا بخوبی پتہ چل سکتا ہے:

۱. شاہ صاحبؒ کے بھائی شاہ رفیع الدینؒ المتوفیٰ ۱۲۳۳ھ
۲. شاہ صاحبؒ کے دوسرے بھائی شاہ عبد القادرؒ المتوفیٰ ۱۲۳۰ھ
۳. مولانا شاہ اسمٰعیل شہیدؒ المتوفیٰ ۱۲۴۶ھ
۴. شاہ محمد اسحٰقؒ المتوفیٰ ۱۲۶۲ھ
۵. شاہ محمد یعقوبؒ المتوفی ۱۲۸۲ھ
۶. سید احمد شہید بریلویؒ المتوفی ۱۲۴۶ھ
۷. مولانا فضل حق خیر آبادیؒ المتوفی ۱۲۷۸ھ (مولانا فضل حق، شاہ عبد القادرؒ کے شاگرد ہیں لیکن انہیں بالواسطہ شاہ عبد العزیزؒ کے شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے۔)
۸. مولانا عبد الحی بڈھانویؒ المتوفی ۱۸۲۸ء وغیرہ

یہ سب حضرات شاہ صاحبؒ سے فیض یاب ہوئے اور آگے چل کر علم و کمال، تقویٰ و تدین تحقیق و تدقیق، تدریس و تعلیم، تصنیف و تالیف، نشر و اشاعت دین، وعظ و تبلیغ اور جہاد فی سبیل اللہ میں بلند مراتب کو پہنچے۔

شاعر

شاہ صاحبؒ عربی کے شاعر اور ادیب بھی تھے، انہوں نے عربی میں بہت سی نظمیں بھی کہی ہیں۔ اپنے چچا شاہ اہل اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام عربی نظم میں ایک خط لکھا جس میں اپنے زمانے کے سیاسی حالات اور مرہٹوں اور سکھوں کی جنگی چالوں اور ان پر ظلم و ستم کی داستان بیان کی ہے۔ شاہ صاحبؒ جامع الحیثیات شخص تھے، وہ بیک وقت جلیل القدر عالم، رفیع المرتبت مفسر، نامور محدث، وسیع النظر فقیہ، شعلہ بیان مقرر، عظیم مناظر، کہنہ مشق مصنف، منجھے ہوئے مدرس، صاحب طرز ادیب اور ممتاز شاعر تھے۔

وفات

بالآخر اس عظیم المرتبت ہستی کی روح بروز یک شنبہ (اتوار) بوقت صبح شوال ۱۲۳۹ھ بمطابق ۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء قفس عنصری سے پرواز کر گئی اور ایک اندازے کے مطابق لوگوں کے ہجوم کے زیادہ ہونے کی وجہ سے ان کی نماز جنازہ پچپن مرتبہ ادا کی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ

نام و نسب

آپ کا نام رفیع الدین ہے اور سلسلہ نسب یہ ہے: رفیع الدین بن احمد (المعروف شاہ ولی اللہؒ) بن عبد الرحیم بن وجیہہ الدین شہید بن معظم بن منصور دہلوی الخ۔ آپ کا سلسلہ نسب اکتیس واسطوں سے امیر المومنین خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ بن الخطاب تک پہنچتا ہے جیسا کہ امام ولی اللہؒ المتوفیٰ ۱۱۷۶ھ فرماتے ہیں: ''سلسلہ نسب ایں فقیر با میر المومنین عمر بن الخطاب می رسد (الامداد فی ماثر الاجداد) اس فقیر کا سلسلہ نسب حضرت عمرؓ بن الخطاب تک پہنچتا ہے۔ اور شاہ صاحبؒ کا سلسلہ نسب والدہ ماجدہ کی طرف سے حضرت امام موسیٰ کاظمؒ تک پہنچتا ہے تو اس لحاظ سے آپ اصلاً عربی اور نسباً فاروقی ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ شاہ ولی اللہؒ کا خاندان سید (سادات) ہیں حالانکہ یہ بات درست نہیں ہے کیونکہ اس خاندان کے افراد کے اسماء کے شروع میں جو شاہ لکھا جاتا ہے، یہ تو ہمارے برصغیر کی اصطلاح ہے کہ جو بھی صوفی اور سالک ہو اس کے نام کے شروع میں شاہ لکھتے ہیں، جیسے شاہ رفیع الدینؒ، شاہ ولی اللہ،، شاہ عبد العزیزؒ، شاہ اشرف علی تھانویؒ وغیرہ۔ اور جو سید ہو اس کے نام کے آخر میں شاہ لکھتے ہیں اور شروع نام میں سید لکھتے ہیں جیسے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ وغیرہ۔

ولادت باسعادت

آپ امام ولی اللہؒ کی دوسری بیوی سے دوسرے صاحبزادے ہیں، آپ کی ولادت باسعادت دہلی میں ۱۱۶۳ھ میں ہوئی۔ امام ولی اللہؒ کی پہلی بیوی میں سے ایک صاحبزادہ محمد تھا جس کے نام کے ساتھ شاہ ولی اللہؒ اپنی کنیت ابو محمد کرتے تھے۔

تعلیم و تربیت

آپ نے تعلیم و تربیت اپنے والد امام ولی اللہؒ اور اپنے بڑے بھائی سراج الہند شاہ عبد العزیزؒ المتوفیٰ ۱۲۳۹ھ سے بھی حاصل کی۔ شاہ رفیع الدینؒ اپنی مایہ ناز کتاب ''دمغ الباطل'' ص ۹۸ میں اس کا تذکرہ فرماتے ہیں کہ میں نے علوم عقلیہ و نقلیہ وادبیہ کی تعلیم اپنے برادر کلاں شیخ عبد العزیزؒ سے حاصل کی۔ شاہ رفیع الدینؒ اور ان کے چھوٹے بھائی شاہ عبد القادرؒ المتوفیٰ ۱۲۳۰ھ دونوں نے تعلیم و تربیت اور فیض اپنے بڑے بھائی سے حاصل کیا۔

شاہ رفیع الدینؒ بیس سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے تھے۔ یہ دونوں بھائی شاہ عبد العزیزؒ کے بہترین معاون بھی ثابت ہوئے۔ عقلی مسائل کے لیے جس قدر تحقیقات کی ضرورت ہوتی تھی شاہ رفیع الدینؒ اسے پورا کرتے تھے اور کشفی

مسائل میں شاہ عبد القادرؒ کو خصوصیت سے امتیاز حاصل تھا۔ نقلی علوم کی تعلیم کے لیے شاہ عبد العزیزؒ مسلم امام تھے۔ گویا عقل و نقل اور کشف کی جامع سوسائٹی (society) بنانے میں ان حضرات کی کوششیں بہت ہی گرانقدر تھیں۔ (کما افادہ مولانا السندھی)

شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: ''مولوی رفیع الدین در رضیات چنداں ترقی کردہ اند کہ شاید موجد آں ہم بودہ باشد یانہ'' مولوی رفیع الدین نے ریاضی میں اس قدر ترقی کی ہے کہ شاید ریاضی کے موجد نے بھی اتنی کی ہو یا نہ۔ اور فرمایا ''در فن ریاضی مثل مولوی رفیع الدین در ہند و ولایت نخواہد بود'' (تاریخ دار العلوم دیوبند ص ۱۰۱ بحوالہ ملفوظات و کمالات) ریاضی کے فن میں مولوی رفیع الدین کی طرح ہند اور ولایت میں کوئی نہیں ہوگا۔

اخلاق و عادات

شاہ صاحبؒ کو پروردگار نے نہایت ہی بردبار، منکسر المزاج، سیر چشم، فیاض، نکتہ شناس حکیم، مستغنی المزاج، متوکل علی اللہ، متقی، ملنسار، خوش اخلاق، ستودہ صفات، پاکیزہ اطوار اور مومنانہ کردار کا حامل بنایا تھا۔ آپ بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ اور جملہ علوم و فنون پر کمال رکھنے والے تھے۔ صاحب الیانع الجنی شیخ محدث محسنؒ نے ان الفاظ میں آپ کی تعریف کی ہے: الشیخ، المحدث، المتقن، المحقق رفیع الدین دہلویؒ۔ اور اسی طرح آپ کے فہم کی بھی بہت تعریف کی ہے۔ آپ علماء راسخین میں سے تھے اور آپ کا علم نہایت ہی ٹھوس تھا۔ آپ فرید الدہر، وحید عصر، صاحب علم و حلم، عمل و تقویٰ، فہم و ذکاء، فراست و دیانت، امانت و مراتب اور ولایت تھے۔ شاہ صاحبؒ نے اخذ طریقت شیخ محمد عاشق پھلتیؒ سے کیا۔ شاہ صاحبؒ عربی کے بہت بڑے شاعر بھی تھے۔

تعلیم و تدریس

آپ برابر تعلیم و تدریس میں مشغول رہے اور بہت سے لوگ آپ سے فیض یاب ہوئے۔ آپ علوم قرآن و حدیث پڑھاتے تھے اور ساتھ ساتھ تصوف و سلوک کی تعلیم و تلقین بھی فرماتے تھے۔ بوقت ضرورت فتاویٰ بھی تحریر فرماتے تھے۔ بعض مسائل میں آپ کی تحقیقات نہایت ہی قیمتی اور بصیرت افروز ہیں اور آپ بہت مختصر الفاظ میں بڑے بڑے مطالب بیان کر دیتے تھے، یہ آپ کا خاص کمال تھا۔ آپ کے بے شمار تلامذہ ہیں۔

سخاوت و خدمت

''صاحب ارواح ثلاثہ'' ایک جگہ لکھتے ہیں کہ امیر شاہ خان صاحب مرحوم نے فرمایا کہ چار شخص شاہ ولی اللہؒ کے خاندان میں بہت سخی تھے، ایک شاہ رفیع الدینؒ، ان کی نسبت سید احمد خان نے لکھا ہے کہ ان کا کیسہ زر ہمیشہ خالی رہتا تھا الخ۔

یہ مکان سے باہر چبوترہ پر بیٹھتے تھے اور اس پر فرش نہ ہوتا تھا، بلکہ صرف چٹائی ہوتی تھی، اور کبھی چٹائی بھی دے دیتے تھے اور خالی زمین پر بیٹھتے تھے۔ سارے محلے کی عورتوں کا کام کیا کرتے تھے۔ میرے استاذ میاں جی محمدی صاحبؒ فرماتے تھے کہ ایک روز شاہ صاحبؒ عورتوں کا سودا خریدنے گئے، چونکہ سودے مختلف اور متعدّد تھے اس لیے اول انہوں نے سودے رومال میں باندھے، جب رومال میں گنجائش نہ رہی تو کرتے میں رکھے، جب اس میں بھی گنجائش نہ رہی اور ایک سودا باقی رہ گیا تو اسے ٹوپی میں لے لیا۔ میں نے عرض کیا، حضرت دال مجھے دے دیجیے اور ٹوپی خالی کر کے اوڑھ لیجیے، تو آپ نے فرمایا کہ نہیں مسلمان کی ہر چیز کام میں آنی چاہیے۔ (ارواح ثلاثہ طبع جدید ص ۴۰،۴۱)

اولاد

شاہ صاحبؒ کے چار لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ لڑکوں میں سے (۱) ایک شاہ مخصوص اللہ المتوفی ۱۲۷۳ھ، (۲) شاہ عیسیٰ جن کی شادی شاہ عبدالعزیزؒ کی صاحبزادی سے ہوئی، (۳) شاہ محمد موسیٰ، (۴) اور شاہ حسن جان ہیں۔ اور لڑکی جس کا نام امۃ اللہ یا امۃ الغفار بی زوجہ نجم الدین سونی پتی ہیں، یہ بہت ہی زاہدہ و عابدہ خاتون تھیں، صحاح ستہ پڑھی ہوئی تھیں (آثار الصنادید ص ۲۶۸)

مسلک

شاہ صاحبؒ خالص حنفی المسلک تھے اور اسی کی تعلیم دیتے تھے، جیسا کہ شیخ محدث محسنؒ نے الیانع الجنی میں ذکر فرمایا ہے کہ ”ان کے والد اور پورا خاندان مسلکاً حنفی تھا۔ اسی طرح شاہ رفیع الدینؒ کے والد امام ولی اللہؒ کا مشہور قول ہے:

ان فی المذھب الحنفی طریقۃ انیقۃ ھی اوفق بالسنۃ المعروفۃ التی جمعت و نقحت فی زمان البخاری واصحابہ (فیوض الحرمین ص ۱۳۶)

”بے شک مذہب حنفی میں ایک ایسا عمدہ طریقہ ہے جو سب سے زیادہ موافق ہے سنت مشہورہ کے، وہ سنت جس کو امام بخاریؒ اور اس کے ساتھیوں کے زمانہ میں منقح کیا گیا۔“

تصانیف

شاہ صاحبؒ کی متعدّد علمی و تحقیقی تصانیف ہیں جن کا اجمالی تعارف حسب ذیل ہے:

۱۔ ترجمہ قرآن کریم

یہ ترجمہ اردو زبان میں سب سے پہلا تحت اللفظ ترجمہ ہے، لفظی تراجم میں نہایت عمدہ اور بہترین ہے۔ اس ترجمہ کے متعلق ”حیاۃ ولی“ کے مصنف نے لکھا ہے: ”قرآن کریم کا لفظی ترجمہ آپ ہی نے کیا ہے جو دریائے جمنا سے لے کر فرات تک نہایت مقبولیت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے اور عوام اس سے مستفیض ہو رہی ہے۔“

۲۔ دمغ الباطل

یہ کتاب مسئلہ وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود پر مشتمل ہے کیونکہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ کو علم الحقائق پر کافی دسترس تھی اس لیے انہوں نے اس کتاب میں اس مسئلہ پر بڑی بسط سے کلام کیا ہے۔ یہ کتاب قلمی تھی اور نایاب تھی اسے والد محترم مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان سواتی مدظلہ العالی فاضل دیوبند و فاضل دارالمبلغین لکھنو و فاضل نظامیہ طبیہ کالج حیدر آباد دکن، بانی مدرسہ نصرت العلوم و جامع مسجد نور گوجرانوالہ، جنہیں فلسفہ ولی اللّٰہی کے ساتھ خاص مناسبت، محبت اور شغف ہے، نے رضا لائبریری رامپور سے حاصل کر کے اسے بڑی محنت و کاوش، عرق ریزی اور لگن کے ساتھ پانچ سال کے طویل عرصے میں اس کی تصحیح کی اور اس پر ایک مفصل مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے۔ اس کتاب کو ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ نے شائع کرنے کی سعادت عظمیٰ حاصل کی ہے، اس کتاب کو بمع کتاب کلمات الحق ادارہ نے شائع کیا ہے۔

۳۔ اسرار المحبۃ

یہ کتاب بھی نایاب تھی، پہلی مرتبہ طبع ہوئی ہے، اس کتاب کو بھی والد محترم نے تصحیح اور مقدمہ سمیت ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ سے شائع کروا کے ناظرین کی خدمت میں پیش کیا ہے۔

۴۔ تکمیل الاذہان

تکمیل الاذہان میں چار باب ہیں۔ ایک منطق، دوسرا امور عامہ، تیسرا تحصیل اور چوتھا تطبیق آراء پر مشتمل ہے۔ امام انقلاب حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ المتوفیٰ ۱۳۶۳ھ نے اس کتاب کی بہت تعریف کی ہے، فرمایا کہ ’’ایسی جامع کتاب اس سے قبل نہیں لکھی گئی۔‘‘

یہ کتاب بھی نایاب تھی، والد محترم کی تصحیح اور مقدمہ مفیدہ کے ساتھ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ نے اسے بھی اپنے روایتی مشن (تبلیغ اور اکابر و اسلاف کی کتب کی اشاعت) کے تحت شائع کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۳۸۴ھ بمطابق ۱۹۶۴ء میں شائع ہوئی تھی، اب اسے دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے متعلق حضرت مولانا علامہ شمس الحق افغانیؒ نے اپنے ایک خط میں اس کی اشاعت پر بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔ اس خط کا عکس مقدمہ تکمیل الاذہان ص ح پر موجود ہے۔

۵۔ تفسیر آیت نور

اس رسالہ میں آیت نور کی تفسیر میں گزشتہ حکماء نے جو کچھ بیان کیا ہے ان کے اقوال و آراء کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ بھی نایاب تھا، اس رسالہ کو بھی والد محترم کی تصحیح اور مقدمہ کے ساتھ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ

نے شائع کیا ہے۔

۶۔ قیامت نامہ یا علامات قیامت

یہ رسالہ فارسی میں ہے، اس میں قیامت اور آخرت کے حالات اور کوائف احادیث مبارکہ سے بیان کیے گئے ہیں۔ نہایت عبرت آموز اور نصیحت افزا ہے، اس کا تو اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ شاہ صاحبؒ کا یہی ایک خاص رسالہ ہے جس سے عوام بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں باقی جملہ کتابیں تو ایسی ہیں جن سے خواص (علماء) ہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

۷۔ مجموعہ رسائل (حصہ اول)

اس مجموعہ کے اندر شاہ صاحبؒ کے دس رسالوں کو جمع کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ کی تصحیح اور اس پر ایک بسیط مقدمہ والد محترم نے لکھا ہے اور بیشتر مقامات میں قارئین کرام کی سہولت کے لیے حواشی سے بھی مزین کیا ہے اس مجموعہ کو بھی ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرت العلوم گوجرانوالہ نے اب دوبارہ شائع کیا ہے۔ ان دس رسالوں کا اجمالی تعارف حسب ذیل ہے:

(۱) رسالہ فوائد نماز: یہ رسالہ فارسی میں ہے، مختصر اور نہایت عجیب و غریب ہے، اس میں نماز کی حقیقت اور مخلوقات کے مختلف طبقات کی نمازوں کا الگ الگ بیان ہے، سالکان طریقت اور اصلان حقیقت کی آگاہی کے لیے لکھا گیا ہے۔

(۲) رسالہ اذان نماز: یہ رسالہ بھی فارسی زبان میں ہے، اس میں شاہ صاحبؒ نے اذان کے کلمات کے تکرار کی حکمت بیان فرمائی ہے اور کلمات اذان کی تشریح بھی نہایت احسن طریقہ پر بیان فرمائی ہے۔

(۳) رسالہ حملۃ العرش: یہ رسالہ بھی فارسی ہے، انسانی فکر میں بہت ہی بلندی پیدا کرتا ہے، اس میں حملۃ العرش کی تحقیق ہے، انتہائی ادق احسن اور مختصر ہے۔ حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے اس کا کچھ اہم ترین حصہ اپنی تفسیر عزیزی میں بھی نقل کر دیا ہے۔

(۴) رسالہ شرح رباعیات: یہ فارسی میں ایک مختصر سا رسالہ ہے، اس میں فارسی زبان کی دو رباعیات ہیں جن میں انسانی حقیقت اور انسان کا تعلق اور قرب، اللہ تعالیٰ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے ان رباعیوں کی شرح لکھی ہے جو نہایت ہی غامض اور علم حقائق سے متعلق ہے۔

(۵) رسالہ بیعت: یہ بھی فارسی زبان میں ہے، اس میں بیعت کی مشروعیت، اس کی ضرورت، فوائد اور اس کی چار قسمیں اور ان کی وضاحت بیان فرمائی ہے۔

(۶) رسالہ شرح چہل کاف: یہ رسالہ عربی زبان میں ہے، اس میں چہل کاف جو کہ ایک مشہور دعا ہے جس میں چالیس کاف آتے ہیں، بہت سے بزرگوں کے معمولات میں سے ہے، یہ شعروں میں ہے اور حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ

المتوفی ۵۶۱ھ کی طرف منسوب ہے، اس کی شرح اور طریقہ خواندگی تحریر فرمایا ہے۔

(۷) رسالہ شرح برہان العاشقین یا حل معمہ: یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے، حضرت خواجہ بندہ غریب نواز گیسودرازؒ المتوفی ۸۲۵ھ کے ایک مختصر ترین رسالہ برہان العاشقین کی شرح ہے جس میں خواجہ صاحب نے انسان کی ترقی کے تمام امکانی مدارج ادنیٰ درجہ سے انتہائی اعلیٰ مراتب تک ایک قصہ اور چیستان یا رمزو اشارہ کی زبان میں بیان کیے ہیں، اس کی شرح شاہ رفیع الدین نے اپنے ذوق کے مطابق کی ہے۔

(۸) رسالہ نذور بزرگان: یہ رسالہ فارسی زبان میں ہے، اس میں اس بات کی تحقیق کی گئی ہے کہ بعض لوگ بزرگوں کے مزارات پر نذرانے لے کر جاتے ہیں، ان کا کیا حکم ہے اور اس کی متعدّد صورتوں پر بھی بحث کی گئی ہے۔

(۹) رسالہ جوابات سوالات اثناعشر: یہ رسالہ بھی فارسی میں ہے، اس میں ان بارہ سوالات کے جوابات ہیں جن میں سے بعض سوالات فقہی ہیں اور بعض علم کلام سے متعلق ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے انتہائی اختصار کے ساتھ اس کی بہت اچھی تحقیق کی ہے۔

(۱۰) فتاویٰ شاہ رفیع الدینؒ: یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور مختلف فقہی، اعتقادی اور چند اصولی و فروعی سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے، اصحاب فتاویٰ کے لیے نہایت مفید اور معلومات افزا ہے۔

۸۔ مجموعہ رسائل (حصہ دوم)

اس مجموعہ میں حضرت مولانا شاہ رفیع الدین محدث دہلویؒ کے انیس علمی و تحقیقی رسائل کو جمع کیا گیا ہے جن میں پندرہ رسائل مخطوطات ہیں جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکے تھے، یہ ہمیں دارالعلوم دیوبند کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئے ہیں، ان کو اہل علم کے استفادہ کی خاطر شائع کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ میں چار رسائل ایسے بھی ہیں جو مطبوعات میں سے ہیں، وہ بھی چونکہ نایاب تھے اس لیے انہیں بھی اس مجموعہ میں منسلک کر دیا گیا ہے، تو اس لحاظ سے یہ کل انیس رسائل ہوئے جن کا مختصر تعارف حسب ذیل ہے:

(۱) شرح رسالہ عقد انامل (عربی) (بمع ضمیمہ اردو): حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ کا رسالہ عقد انامل جو چند سطور پر مشتمل ہے، اس کا مطبوعہ نسخہ بمع رسالہ عقد انامل جس کا ترجمہ اور شرح ولی اللّٰہی سلسلہ کے ایک صاحب مولانا عبد الرحمٰن شاکرؒ نے لکھا ہے، یہ رسالہ ہمیں دستیاب ہوا اور اس کو بمع شرح کے ہی ہم نے مجموعہ رسائل حصہ دوم میں شامل کر لیا ہے جس کے صرف چار صفحات ہیں۔ اس کی طباعت دیگر چار رسائل کے ساتھ مطبع نظامی کانپور میں ۱۲۷۳ھ میں مولوی عبد الرحمٰن شاکرؒ اور ان کے والد روشن خانؒ نے اپنے اہتمام سے کرائی تھی، اس وقت کی اردو زبان جس طرح چل رہی تھی اسی میں یہ ترجمہ کیا ہے اور اس کی وضاحت بھی ساتھ کر دی ہے۔

نوٹ: اس رسالہ کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی منسلک کیا گیا ہے جو کہ والد محترم حضرت مولانا صوفی عبد الحمید خان صاحب سواتی مدظلہ نے تحریر فرمایا ہے، یہ ضمیمہ اردو زبان میں ہے۔

(۲) تحقیق الالوان (فارسی): اسی طرح شاہ رفیع الدینؒ کا دوسرا رسالہ تحقیق الالوان بمع شرح تحفۃ الاخوان ہے، یہ ترجمہ اور شرح بھی انہی مولانا عبد الرحمٰن بن روشنؒ کا ہے۔ اصل رسالہ فارسی میں ہے، بڑے سائز کے ایک صفحہ میں ہے، جب کہ اس کی شرح بڑے سائز کے ۵۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور اس کو بھی انہوں نے ۱۲۸۲ھ میں طبع کرایا تھا۔ ہم نے صرف فارسی متن ہی طبع کرایا ہے، شرح غیر ضروری طوالت کی بناء پر ترک کر دی ہے، اس رسالہ کا نسخہ ہمیں مولانا ڈاکٹر عبد الحلیم چشتی صاحب (فاضل دیوبند) کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا اور انہوں نے ہی اس کی فوٹو کاپی کرانے کی اجازت دی۔ یہ رسالہ بڑا اہم ہے، شاہ رفیع الدینؒ نے، جو رنگ شریعت میں استعمال کرنے ناجائز ہیں، جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے ان کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔

(۳) رسالہ سید کبیر احمد کی گائے اور شیخ سدو کا بکرا (فارسی) (نذر لغیر اللہ کی وضاحت): اسی طرح یہ رسالہ بھی مطبوعات میں تھا، یہ دراصل شاہ رفیع الدینؒ کا ایک فتوی ہے جو دیگر فتاویٰ کے ساتھ اس کو مولوی تراب علیؒ تلمیذ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے اپنی کتاب زبدۃ النصائح فی مسائل الذبائح میں درج کیا ہے اور یہ فتویٰ شاہ رفیع الدینؒ نے ۱۲۳۱ھ میں لکھا تھا۔ زبدۃ النصائح مطبع محمدی میں ۱۲۶۷ھ میں طبع ہوئی تھی، اس کی نقل ہم نے اسی کتاب کی فوٹو کاپی سے لی ہے۔

(۴) ترکیب خواندن سورۃ یوسف (فارسی): یہ رسالہ مخطوطہ ہے جو ہمیں دار العلوم دیوبند کے کتب خانہ سے حاصل ہوا ہے، یہ پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس میں سورۃ یوسف کے پڑھنے کی ترکیب اور اس کے فوائد وخاصیات کا ذکر ہے کہ کشائش رزق اور اپنے کاموں کے لیے اس کی تلاوت کس طریقہ سے کی جائے، یہ رسالہ عملیات سے متعلق ہے۔

(۵) رسالہ تحقیق شق القمر (فارسی): یہ رسالہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزہ شق القمر یعنی چاند کے ٹکڑے ہونے کے ثبوت کے متعلق بحث ہے اور منکرین شق القمر کے اعتراضات کے بڑے حکیمانہ انداز میں جوابات مذکور ہیں، غالباً یہ رسالہ پہلے طبع بھی ہو چکا ہے لیکن ہمیں دستیاب نہیں ہوا۔

(۶) رسالہ تحقیق آیات وقرات (فارسی) بمع القول المقرر (فارسی): یہ رسالہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں قرآن کریم کی آیات اور قرات کے متعلق بحث ہے، قراء سبعہ اور ان کی قرات اور قرآن کریم کے اوقاف کا تذکرہ بھی ہے اور یہ جملہ بحث سوال وجواب کی صورت میں ہے۔

اس رسالہ کے ساتھ بطور ضمیمہ "القول المقرر" بھی منسلک ہے جو کہ میر محمد حسن المعروف حسن علیؒ کی تصنیف ہے، یہ بھی مخطوطہ ہے، یہ بھی پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس میں بھی قراء سبعہ اور ان کے حالات اور تعارف، ان کی موالید و وفیات کا بڑے احسن انداز میں ذکر کیا گیا ہے، مفید ہونے کی وجہ سے اسے بھی شاہ صاحبؒ کے رسالہ کے ساتھ طبع کرایا گیا ہے۔

(۷) رسالہ تحقیق طلوع وغروب (فارسی): یہ رسالہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس میں سورج کے طلوع وغروب کی تحقیق سوال وجواب کے انداز میں مذکور ہے۔

(۸) قاعدہ مناسخہ در علم فرائض (فارسی): یہ رسالہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں علم فرائض یعنی وراثت کے متعلق بحث کی گئی ہے اور علم فرائض کا ایک مشکل مسئلہ ذکر کیا ہے۔

(۹) قاعدہ تحریم النساء (فارسی): اس رسالہ میں ان عورتوں کا تذکرہ ہے جن کے ساتھ شریعت میں نکاح کرنا حرام ہے اور ان کی اقسام بڑے احسن انداز میں مذکور ہیں، یہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے۔

(۱۰) رسالہ اصطرلاب (فارسی): یہ رسالہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں قدیم ریاضی کے متعلق معلومات ہیں، یہ رسالہ طول بلد، عرض بلد معلوم کرنے کے لیے مفید ہے۔

(۱۱) سوالات فارسی: یہ رسالہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں مختلف علمی سوالات کے جوابات مذکور ہیں، کچھ سوالات آیات کے بارہ میں ہیں اور کچھ دوسری علمی باتوں کے بارہ میں ہیں۔

(۱۲) رسالہ حکم الصلوٰۃ والصوم فی ارض التسعین (عربی): یہ رسالہ مطبوعات میں سے ہے جو پہلے طبع ہو چکے ہیں، ہم نے اس رسالہ کی نقل کتاب ''لقطۃ العجلان'' طبع مطبع نظامی کانپور ۱۲۹۱ھ ص ۸۲ تا ۸۴ سے لی ہے، یہ کتاب نواب صدیق حسن خان مرحوم کی تصنیف ہے، اس میں شاہ رفیع الدینؒ کا یہ پورا رسالہ انہوں نے نقل کیا ہے، اس رسالہ کا اردو ترجمہ پورا کتاب نماز مسنون کلاں مصنفہ حضرت مولانا صوفی عبدالحمید خان صاحب سواتی مدظلہ کے ص ۱۹۵ تا ۲۰۰ میں نقل کر دیا گیا ہے، اردو خواں حضرات اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

(۱۳) رسالہ سوالات وجوابات متفرقہ در عربی: یہ رسالہ مخطوطات میں سے ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں سوالات وجوابات کی صورت میں ستاروں اور فلکیات کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

(۱۴) رسالہ تحقیق قدم وحدوث عالم وتدوین تاریخ (عربی): یہ رسالہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں جہان کے قدیم اور حادث ہونے کے متعلق، ہبوط آدم علیہ السلام کے متعلق اور تاریخ کے متعلق بحث مذکور ہے۔

(۱۵) رسالہ تحقیق الایمان (عربی): یہ رسالہ بھی مخطوطات میں سے ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں ایمان کے مختلف معانی پر بحث کی گئی ہے۔

(۱۶) رسالہ اولاد رسول (عربی): یہ رسالہ بھی مخطوطات میں سے ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں سیر اور تاریخ کے حوالہ سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی اولاد کے متعلق معلومات ذکر کی گئی ہیں۔

(۱۷) رسالہ اعتقاد نجوم (عربی): یہ رسالہ مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں ستاروں کے موثر اور غیر موثر ہونے کے متعلق اعتقاد رکھنے کا ذکر اور اس میں مختلف مذاہب کے متعلق بحث کی گئی ہے۔

(۱۸) رسالہ شرح مسئلہ منطقیہ تصوریہ (عربی): یہ رسالہ بھی مخطوطہ ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہوا ہے، اس رسالہ میں علم منطق کی تین اصطلاحات بشرط شی، بشرط لاشی اور لابشرط شی کی تفصیل اور شرح بڑے احسن پیرائے میں کی گئی ہے اور فن منطق میں ان اصطلاحات کے فائدہ کے متعلق روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱۹) حواشی شرح چغمینی (عربی): یہ رسالہ بھی مخطوطات میں سے ہے اور پہلی مرتبہ شائع ہو کر منظر عام پر آیا ہے، یہ رسالہ ریاضی قدیم پر مشتمل ہے اور شرح چغمینی جو ریاضی قدیم کی مشہور کتاب ہے اس کے ایک ادق اور مشکل مقام کا حاشیہ اس رسالہ میں مذکور ہے۔

۹۔ رسالہ فی علم العروض

یہ رسالہ پہلے طبع ہو چکا ہے، اس کا تذکرہ صاحب حدائق الحنفیہ مولوی فقیر محمد جہلمیؒ المتوفیٰ ۱۳۳۴ھ نے کیا ہے۔

۱۰۔ رسالہ مقدمۃ العلم (عربی)

یہ ایک مختصر سا رسالہ ہے، یہ رسالہ الگ کتابی صورت میں نہیں مل سکا اور نہ ہی کوئی قلمی نسخہ دستیاب ہو سکا، افادیت کے پیش نظر اسے تکمیل الاذہان کے ساتھ منسلک کر کے طبع کرایا گیا ہے، یہ رسالہ مکمل طور پر نواب صدیق حسن خان نے اپنی کتاب ابجد العلوم مطبوعہ صدیقیہ بھوپال ۱۲۹۵ھ میں نقل کیا ہے۔

۱۱۔ رسالہ فی اثبات شق القمر وابطال براہین الحکمۃ

یہ لکھنؤ سے غالباً پہلے طبع ہو چکا ہے اب نایاب ہے، اس رسالہ کا تذکرہ صاحب حدائق الحنفیہ نے اور مولانا نظام الدین کیرانویؒ نے بھی حاشیہ میزان العقائد ص ۲۶ پر کیا ہے۔

۱۲۔ رسالہ فی الحجاب

یہ نایاب ہے۔

۱۳۔ رسالہ فی برہان التمانع

یہ نایاب ہے۔

۱۴۔ رسالہ سمت قبلہ

یہ رسالہ نایاب ہے۔

۱۵۔ حاشیہ علیٰ میر زاہد رسالہ فی بحث العلم

یہ رسالہ بھی ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم شائع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

۱۶۔ تکمیل الصناعہ

اگر اس کتاب سے مراد تکمیل الاذہان ہے تو وہ طبع ہو چکی ہے ورنہ یہ نایاب ہے۔

۱۷۔ قصیدۃ عینیہ فی رد قصیدۃ الشیخ ابن سینا

یہ اسرار المحبۃ کے ساتھ طبع ہو چکا ہے۔

۱۸۔ رسالہ تعدیلات الخمسۃ المتحیرہ

یہ نایاب ہے۔

۱۹۔ تخمیس علیٰ بعض القصائد الوالدہ فی تحقیق مسئلہ وحدۃ الوجود

یہ بھی اسرار المحبۃ مطبوعہ ادارہ نشر و اشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے ساتھ چھپ چکا ہے۔

۲۰۔ قصیدہ فی بیان معراج النبیؐ

یہ بھی اسرار المحبۃ کے ساتھ طبع ہو چکا ہے۔

۲۱۔ راہ نجات اردو

یہ مطبوعہ ہے، اس کا ذکر حدائق الحنفیہ میں موجود ہے۔

۲۲۔ تفسیر سورۃ البقرہ (تفسیر رفیعی)

اس کا ذکر ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے اپنے ایک انگلش مضمون میں کیا ہے جس کا اردو ترجمہ بنام ''نگار پاکستان'' جنوری ۱۹۶۳ء ص ۱۹-۲۲ میں موجود ہے، یہ نایاب ہے۔

۲۳۔ تنبیہ الغافلین

اس کا ذکر بھی ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی نے ''نگار پاکستان'' میں کیا ہے، یہ بھی نایاب ہے۔

۲۴۔ الدرر والدراری

یہ بھی شاہ صاحبؒ کی ایک اہم کتاب ہے، اس کا ذکر تطبیق الاراء کے دیباچہ میں ہے۔ اور رسالہ جوابات اثنا عشر میں شاہ صاحبؒ نے حوالہ کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے، یہ بھی نایاب ہے۔

۲۵۔ منہیات تکمیل الاذہان

یہ نایاب ہے۔

۲۶۔ مخمس

یہ رسالہ اسرار المحبۃ کے ساتھ طبع ہوچکا ہے۔

۲۷۔ رسالہ فی المنطق

اس کا ذکر بھی صاحب حدائق الحنفیہ نے کیا ہے جو کہ نایاب ہے۔

شاہ رفیع الدینؒ کی جملہ کتب دستیاب نہیں ہیں، ہوسکتا ہے کہ بہت سی کتب، جن کا تذکرہ تذکرہ نگاروں نے کیا ہے، حوادثات زمانہ کے پیش نظر ضائع ہوچکی ہوں۔ بہرحال ان کی جتنی کتابیں مل سکی ہیں ان کو والد محترم مدظلہ نے تصحیح فرما کر اور ان پر مقدمات اور حواشی سے مزین کر کے ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کے ذریعہ طبع کروائی ہیں اور یہ پورے برصغیر میں صرف ادارہ نشر واشاعت مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کی ہی خصوصیت ہے کہ شاہ صاحبؒ کی بیشتر کتابیں یہیں سے شائع ہوئیں ہیں وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

وفات حسرت آیات

شاہ صاحبؒ کی وفات کی تاریخ میں تذکرہ نگاروں نے اختلاف کیا ہے، مولانا فقیر محمد جہلمیؒ نے حدائق الحنفیہ ص ۴۷۰ میں ۱۲۳۸ھ ذکر کی ہے اور مولانا رحمٰن علیؒ نے تذکرہ علماء ہند فارسی ص ۶۶ میں ۱۲۴۹ھ ذکر کی ہے، لیکن یہ دونوں تاریخیں غلط معلوم ہوتی ہیں۔ محقق بات یہ ہے کہ شاہ صاحبؒ کی وفات ستر سال کی عمر میں ۶ شوال ۱۲۳۳ھ دہلی میں واقع ہوئی ہے، اسی بات کو مولانا نور الحقؒ نے ذکر کیا ہے اور بشیر الدین احمد نے بھی ''واقعات دہلی'' مطبوعہ ۱۹۱۸ء کے ص ۵۸۸ ج ۲ پر اسی تاریخ وفات کا ذکر کیا ہے۔

شاہ ولی اللہؒ کے چاروں صاحبزادگان کی وفات معکوس ترتیب سے ہوئی ہے، سب سے پہلے سب سے چھوٹے صاحبزادے شاہ عبد الغنیؒ کی ۱۲۲۷ھ میں، اور ان سے بڑے شاہ عبد القادر کی ۱۲۳۰ھ میں، اور ان سے بڑے شاہ رفیع الدینؒ کی ۱۲۳۳ھ میں اور ان سے بڑے شاہ عبد العزیزؒ کی ۱۲۳۹ھ میں ہوئی۔

شاہ رفیع الدینؒ کی وفات سے جہاں پورا عالم ایک نامور محقق مدقق عالم سے محروم ہوگیا، وہاں ان کے بڑے بھائی شاہ عبد العزیزؒ کا رنجیدہ خاطر ہونا طبعی امر تھا، وہ بہت متاثر اور غمگین تھے، اس وقت نابینا بھی تھے۔ نیز ''جامع ملفوظات'' والے نے لکھا ہے کہ شاہ عبد العزیزؒ نے باوجود نابینا ہونے کے ان کی چارپائی اٹھانے کی کوشش کی اور انتہائی ضبط کی کوشش کے باوجود بار بار بلبلا اٹھنا اور فرمانا کہ ''چہ گویم من طاقتے ندارم'' (تذکرہ شاہ ولی اللہ از مولانا مناظر احسن گیلانیؒ) واللہ اعلم

بالصواب۔

شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ

حضرت مولانا شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے تیسرے فرزند ہیں، یہ بھی اپنے بڑے بھائیوں کی طرح عالم باعمل تھے، فقیہ وفاضل، زاہد وعابد تھے، کم گو اور گوشہ نشینی کو پسند فرماتے تھے، علم حدیث، تفسیر، فقہ اور دیگر علوم وفنون میں حاذق اتم تھے، نیز صاحب کشف، صادق الفراست اور اتقاء وورع میں کامل تھے۔

آپ کی ولادت ۱۱۶۷ھ میں دہلی کے اندر ہوئی، اکثر علوم وفنون اپنے بڑے بھائی سراج الہند حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے حاصل کئے، اس کے بعد تمام عمر درس و تدریس میں اور علوم دینیہ کے پھیلانے میں صرف کر دی، خواص وعوام آپ کے علوم وفیوض سے سیراب ہوئے۔

شاہ صاحبؒ نے موضح القرآن کے نام سے اردو میں نہایت فصیح وبلیغ قرآن کریم کا ترجمہ کیا جو آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ آپ نے دہلی میں کنگ ایڈورڈ روڈ پر واقع اکبری مسجد میں بارہ برس اعتکاف کیا اور اس دوران انہوں نے قرآن کریم کا یہ ترجمہ کیا۔ آپ چونکہ عزلت نشینی کو پسند فرماتے تھے اس لیے تمام عمر اکبری مسجد کے ایک حجرے میں ہی بسر کر دی، اس مسجد کو بعد میں انگریزوں نے منہدم کر دیا تھا۔

آپ کی وفات کے متعلق علامہ فقیر محمد جہلمیؒ نے اپنی مشہور زمانہ تصنیف حدائق الحنفیہ میں ۱۲۴۲ھ کا قول کیا ہے جو کہ درست نہیں ہے، اکثر محققین کے نزدیک آپ کی وفات ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ بمطابق ۱۸۱۴ء میں ہوئی، اسی کو تذکرہ علماء ہند میں ذکر کیا گیا ہے۔

شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ

حضرت مولانا شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ بھی حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے چوتھے فرزند ہیں، آپ کی ولادت ۲۵ شعبان ۱۱۷۰ھ بمطابق ۷ جون ۱۸۲۰ء میں دہلی کے اندر ہوئی جبکہ سرسید احمد خان نے آثار الصنادید میں ۱۲۲۴ھ بروز ہفتہ بعد از نماز عشاء لکھی ہے۔ لیکن ان کی وفات شاہ صاحبؒ کے چار فرزندان گرامی میں سے سب سے پہلے ۶ محرم ۱۲۲۷ھ بمطابق یکم جنوری ۱۸۷۹ء میں ہوئی، انہوں نے تھوڑی ہی عمر پائی، آپ کی اہلیہ کا نام بی بی فاطمہ تھا جن سے ایک فرزند ارجمند حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہیدؒ پیدا ہوئے، شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ابھی دس برس ہی عمر پائی تھی کہ ان کے والد کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا، والد کی وفات کے بعد یہ اپنے چچاؤں کی زیر سرپرستی تعلیم و تربیت حاصل کرتے رہے، جس کا نتیجہ ان کے کارہائے نمایاں کی صورت میں تحریک حریت کا ایک زرین باب بنا، بالآخر انہوں نے بالاکوٹ کے معرکہ میں ۱۲۴۶ھ میں جام شہادت نوش کیا اور وہیں دفن ہوئے۔

ماخذ

(۱)الامداد فی ماثر الاجداد
(۲)الجزء اللطیف
(۳)نزہۃ الخواطر
(۴)تفہیمات الٰہیہ
(۵)الیانع الجنی
(۶)حیاۃ ولی
(۷)شاہ ولی اللہ اور ان کے سیاسی مکتوبات
(۸)حجۃ اللہ البالغہ
(۹)عقد الجید فی احکام الاجتہاد والتقلید
(۱۰)فیوض الحرمین
(۱۱)الانصاف فی بیان سبب الاختلاف
(۱۲)تصنیف رنگین
(۱۳)اتحاف النبلاء
(۱۴)ملفوظات وکمالات
(۱۵)تاریخ دار العلوم دیوبند
(۱۶)ارواح ثلاثہ
(۱۷)آثار الصنادید
(۱۸)مقدمہ تکمیل الاذہان
(۱۹)نگار پاکستان
(۲۰)حدائق الحنفیہ
(۲۱)تذکرہ علماء دیوبند
(۲۲)واقعات دہلی
(۲۳)تذکرہ شاہ ولی اللہ
(۲۴)الارشاد فی مہمات الاسناد

اعترافِ فضل وکمال اور معاصرین

حضرت نیموی کے فضل وکمال کا اعتراف ان کے معاصرین نے دل کھول کر کیا ہے، جس میں ادباء وعلماء اور محدثین دونوں طبقے شامل ہیں۔ ان کے باکمال استاد حضرت مولانا سعید حسرت عظیم آبادی نے جن بلند الفاظ میں ان کے کمال کو سراہا تھا، عظیم آباد و لکھنؤ کے باکمالوں نے جس طرح ان کو خراج تحسین پیش کیا وہ ان کی سوانح زندگی کا روشن باب ہے، اور صفحات گذشتہ میں گذر چکا ہے۔

مشہور عالم ومحدث علامہ انور شاہ کشمیری نے بھی بڑے بلند الفاظ میں ان کا اعتراف کیا ہے، مولانا منظور نعمانی اپنے استاد کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

> ”جب علامہ نیموی کا ذکر آگیا ہے تو اس واقعہ کا اظہار بھی میرے لئے ضروری ہے کہ حضرت استاد رحمۃ اللہ علیہ فن حدیث میں علامہ ممدوح کا مقام بہت بلند مانتے تھے، اور معرفت علل واسانید میں ہندوستان کے کسی دوسرے عالم کو ان کا عدیل وشیل نہیں قرار دیتے تھے، اس عاجز کو خوب یاد ہے کہ یہاں تک فرماتے تھے کہ مولانا ظہیر احسن صاحب حضرت مولانا عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ (لکھنوی فرنگی محلی) کے شاگرد ہیں لیکن صناعت حدیث میں ان سے فائق ہیں“۔[72]

مولانا عبدالحق لکھنوی مہاجر مکی شیخ الدلائل نے جب ان کو ان کی طلب پر اجازت حدیث ارسال فرمائی تو ان کے کمال کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو الامام الہمام کے الفاظ سے ذکر کیا، اور لکھا:

> ”فقد التمس منی الشیخ الفاضل السابق فی حلبة الفضائل الباذل فی تحصیل العلوم الشرعیة، والمجهد المشمر فی اقتناصها عن ساعد الجد مولانا العلامة الفهامة المحقق المدقق المولوی محمد ظهیر احسن“۔[73]

ایک ایرانی فاضل عبداللہ خاکی ساکن شہر رشت (دارالمرز رشت ایران) نے ان کی تحقیقات لغوی کے متعلق پورا قصیدہ کہا، جو ان کی کتاب ازاحۃ الاغلاط کے اخیر میں ہے، اور جس کے چند اشعار یہ ہیں:

صدف فخرش بود از گوہرش در لجہ دریا — خورد از آب نیساں قطرہ وگوہر شود پیدا
درے را در نظر دارم کہ باشد گوہر مکنوں — جواہر خیز وگوہر ریزو گوہر بیز وگوہر زا
کہ بود او جوہرے در ذات استقلال خود قائم — ہیولایش شد وکردند بہرش صورت یکتا
چہ صورت صورت انسانی وہم شکل روحانی — ازیں صورت مرکب از ہیولیٰ گشت وشد پیدا
تعالی اللہ از علم لدنی بود او ماہر — نمود ادراک علم کائنات وسر مافیہا

ان کے علاوہ علمائے دیوبند میں مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی اور علامہ انور شاہ کشمیری سب ان کے فضل وکمال کے معترف رہے۔ پٹنہ میں براہ راست ان کے تلامذہ یا معاصرین کی کوئی تحریر ان کے اعتراف کمال میں ہمارے پیش نظر نہیں، عظیم آباد میں اس وقت علماء کی ایک بڑی تعداد تھی لیکن کسی سے ان کے بہت زیادہ تعلق کا پتہ نہیں چلتا، علامہ شمس الحق عظیم آبادی تو ان کے عزیز ہی تھے لیکن ان سے بھی براہ راست وسیع ربط و تعلق کا پتہ نہیں چلتا۔ اسانید وروایات کے مشہور مصنف شیخ احمد ابوالخیر مکی جو ان کے استاد مولانا سعید حسرت عظیم آبادی کے شاگرد تھے ان سے بھی ان کے اچھے مراسم تھے، چنانچہ اپنے مجموعہ اسانید میں انہوں نے ان شیخ مکی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

هو صاحب اسانيد كثيرة من اهل الشان استوعبها فی معجمه الكبير الذی لم يتفق طبعه الی الآن، وهو من اكابر احبابی، قد صحبته ازمنة كثيرة واستفدت منه فوائد غزيرة، ابقاه الله وسلمه وحماه۔[74]

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے معاصرین کا دائرہ بہت وسیع تھا، لیکن شیخ ابوالخیر مکی نے اپنے مجموعہ اسانید (النفح المسکی جو حال ہی میں شائع ہوئی ہے) میں جس کا ذکر ان حضرت نیموی کی تحریر میں گذرا، اپنے اس معاصر ذکر نہیں کیا ہے، اغلب یہ ہے کہ وہ ان سے بہت چھوٹے ہوں گے، البتہ ان کے استاد مولانا سعید حسرت عظیم آبادی کا بہت تفصیلی ذکر ہے، اور لکھا ہے کہ وہ کے پاس ایک مدت تک رہے۔

علوم اسلامیہ کے علاوہ ان کے معاصرین میں ان کے ادبی کمال کا اعتراف خوب ملتا ہے، جو اوپر گذر چکا ہے۔

حضرت نیموی کے فرزند گرامی نے ان کے حالات پر جو رسالہ لکھا ہے، اس میں بھی بہت سے اہل کمال کے اعترافات ذکر کئے ہیں، یہاں اس کا اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے ان اعترافات کو نقل پیش کیا جارہا ہے اور اخیر میں خود مولانا فوقانی نے جو کچھ اپنے حالات لکھے وہ بھی درج کئے جاتے ہیں۔ آغاز میں گذر چکا ہے کہ ان کے بقول اس رسالہ کا نام

تذکار الشوق ہے، اس کے آغاز میں وہ لکھتے ہیں:

''فوقانی ابن شوق نیموی عرض کرتا ہے کہ بعض احباب ندوی نے فرمائش کی کہ علامہ شوق نیموی کی حیات بعد الممات (یعنی وہ سوانح عمری کہ جس کا ذکر یادگار وطن میں نہیں ہے) مرتب کر دی جائے، کہ آئندہ لوگوں کو سوانح کے انتخاب کرنے میں دشواری نہ ہو، صاحب البیت ادریٰ بمافیہ۔ اس لئے رسالۂ موسومہ بتذکار الشوق معرض تحریر میں لاتا ہوں، امیدوار ہوں کہ مرقوم علیہ اور راقم کو دعائے خیر میں یاد فرمائیں''۔

اس کے بعد انہوں نے عنوان قائم کیا ہے ''حدیث دانی علامہ شوق نیموی''، اس کے ذیل میں لکھتے ہیں:

''آپ فن حدیث میں متقدمین کے ہم پایہ بلکہ بعض امور میں بالا [تھے]، لیکن الفضل للمتقدم، یعنی بزرگی متاخرین پر متقدمین ہی کی تسلیم کی گئی ہے''۔

آگے لکھتے ہیں:

''علامہ نیموی نے اکثر احادیث میں علل غامضہ کا اظہار جو کہ اغمض انواع علم حدیث ہے محدثانہ ومحققانہ طور پر، جن سے کتب متقدمین بھی خالی ہیں''۔

اس کے بعد ان کتابوں کی فہرست ہے جن کی حضرت نیموی کی تحقیقات نقل کی گئی ہیں، یہ فہرست تو بہت طویل ہے اور عام طور پر معروف بھی اس لئے اس کے نقل کرنے کی ضرورت نہیں، ویسے بھی یہ معروف ہے کہ فقہ حنفی کی روایات پر اس کتاب کے بعد جو بھی کتاب لکھی گئی وہ شاید ہی سے اس کے ذکر سے خالی ہے، البتہ اس فہرست میں ایک اہم نام نہیں آسکا ہے، وہ علامہ عمیم الاحسان مجددی کی فقہ السنن والآثار، جس میں جابجا علامہ نیموی کی تحقیقات کے حوالے دئے گئے ہیں۔ اس کے بعد حضرت فوقانی لکھتے ہیں:

''ماہ دسمبر ۱۹۲۵ء کو اخبار الجمعیہ دہلی میں یہ مضمون چھپا... حضرت علامہ شوق نیموی کی اس گرامی سے اہل علم کا طبقہ بخوبی واقف ہے، اس آخری دور میں اس بزرگ نے مذہب حنفی کی جس فاضلانہ طریقہ سے خدمت انجام دی ہے اس کی نظیر متقدمین بھی مشکل سے ملے گی، افسوس، مولانا کی عمر نے وفا نہ کی، ورنہ فقہ حنفی کی تائید میں ایسی بیش بہا تصنیف ہوتی کہ پھر کسی دوسری کتاب کی احتیاج ہی باقی نہ رہتی''۔[75]

اخبار العدل گوجرانوالا ۱۳ و ۱۶ جون ۱۹۳۴ کا حسب ذیل اقتباس بھی مولانا فوقانی نے نقل کیا ہے:

''آثار السنن حضرت مولانا ظہیر احسن صاحب شوق نیموی کی مشہور معرکۃ الآراء عربی تالیف ہے، جس نے دنیائے اسلام پر حنفیت کا سکہ بٹھا دیا ہے، اس مفید تالیف میں ہر حدیث کے متعلق علامہ ممدوح نے مناسب مقام پر رجال اور متن پر ضروری بحث کی ہے، احناف کے لئے بہترین کتاب

ہے"۔[76]

ایک اور فاضل کا اعتراف ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

"اور مولانا مفتی جناب فقیر اللہ رائے پوری جالندھری پنجابی نے بندہ محمد عبدالرشید کو ایک خط مورخہ ۱۳۴۵ھ میں تحریر فرمایا کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیری تمامی کتب رجال پر آثار السنن کو ترجیح دیتے ہیں، اگر مولانا نیموی کا ابھی انتقال نہ ہوتا اور ابواب معاملات اپنی زندگی میں تحریر فرماتے تو پھر دوسری کتاب کی چنداں ضرورت ہی باقی نہ رہتی، پھر ایک خط میں یہ تحریر فرماتے ہیں کہ میں نے حضرات دیوبند[77] سے یہ سنا ہے کہ فن حدیث میں مولانا شوق نیموی اپنے استاد حضرت مولانا عبدالحی صاحب لکھنوی سے بڑھ کر تھے، اور مولانا محمد سہول بھاگلپوری پرنسپل مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ نے بالمشافہہ بندہ میں عبدالرشید ابن شوق نیموی سے فرمایا کہ ہم لوگ دیوبند میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، کسی نے کہا کہ بالفعل مولانا اشرف علی تھانوی آثار السنن کے طرز پر ایک کتاب تالیف کر رہے ہیں، یہ سن کر شیخ الہند نے فرمایا کہ مولانا اشرف علی میرے شاگرد بھی ہیں لیکن وہ آثار السنن کے طرز پر نہیں لکھ سکتے"۔[78]

آگے لکھتے ہیں:

"مولانا شوق اور مولانا رشید احمد گنگوہی سے بھی خط و کتابت ہوا کرتی تھی، بعض خطوط مولانا گنگوہی کے میرے پاس موجود تھے جو ۱۹۴۶ء کے ہنگامۂ فساد بہار میں ضائع ہو گئے۔ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن دیوبندی سے بھی دوستانہ تعلقات تھے۔ چنانچہ رسالہ سرّ من یریٰ فی بحث الجمعۃ فی القریٰ مطبوعہ ۱۳۲۷ ہجری میں مؤلفہ مولانا عبدالرحمن بقاغازی پوری مرحوم لکھتے ہیں، اس کا جواب آپ (یعنی مولانا محمود حسن) ۱۲۷۷ھ میں احسن القریٰ میں فرماتے ہیں، مولانا ظہیر احسن سے صلاۃ العید فی القریٰ یکرہ تحریماً کی دلیل پوچھی جاتی ہے، جس سے ارشاد السوال نصف العلم کی تصدیق ہوتی ہے"۔

اس کے بعد حضرت شوق کی فارسی وارددوانی پر تبصرے ہیں جو ان کی کتابوں کی روشنی میں مرتب کئے گئے ہیں۔[79]

اسنادِ حدیث

حضرت شوق نیموی بڑے محدث تھے، اس لئے ان کی سند بھی عالی ہونی چاہئے۔ لیکن انہوں نے کتب حدیث صرف حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی تھی، پھر انہوں نے اپنے شیخ حضرت گنج مرادآبادی سے مسلسل بالاولیہ اور دیگر کتب حدیث کی اجازت لی تھی جس کا ذکر گذر چکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی آثار السنن کی پہلی جلد مکہ مکرمہ بھیج کر شیخ الدلائل مولانا عبدالحق الہ آبادی ثم مکی سے بھی اجازت حدیث حاصل کی تھی، اس سے اندازہ

ہوتا ہے کہ وہ اس فن میں کمال کے ساتھ سند کو بھی اہمیت دیتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنے اسانید کا مجموعہ بھی عمدۃ العناقید من حدائق بعض الاسانید کے عنوان سے مرتب کیا۔ پھر اس کی اجازت اپنے اہل عصر اور اس کے ساتھ اپنے چھوٹے فرزند مولانا عبدالرشید فوقانی کو بھی دی، مولانا فوقانی نے اپنے دور کے معروف عالم مولانا پروفیسر حبیب الحق ندوی کو دی تھی،[80] انہوں نے کسی کو دی یا نہیں اس کا علم اب تک نہیں ہوسکا، کاش اس کا سراغ مل جائے تاکہ ان کی سند کا تسلسل باقی رہے، ورنہ ایسے بڑے محدث کی سند منقطع ہو جائے گی، ایک مدت تک راقم کو مولانا عبدالرشید کی اجازت دینے کا بھی علم نہیں تھا کہ اچانک مولانا حبیب الحق ندوی کی تحریر سے اس کا علم ہوا۔

اسفار

علامہ شوق نے کن طالب علمی کی تکمیل کے بعد کن مقامات کا سفر کیا، اس کی تفصیل نہیں ملتی، اگر وہ اسی طرح اور بھی اسفار کی روداد قلمبند کرنے کا التزام کرتے تو ادب کے سرمایہ میں بھی اضافہ ہوتا اور ان کی سوانح کے ساتھ تاریخ کا ایک اہم حصہ بھی محفوظ ہوتا، لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے اور کن مقامات کا سفر کیا، لیکن انہوں نے اپنی خود نوشت میں لکھا تھا کہ آثار السنن نام حدیث کی ایک کتاب کی تصنیف پیش نظر ہے، جس کے لئے بلاد اسلامیہ کے سفر کا ارادہ ہے، لیکن بیرون ہند کا سفر تو وہ نہیں کر سکے ورنہ ان کی زندگی میں کہیں نہ کہیں اس کا ذکر ضرور ہوتا، یا ان کے معاصرین ذکر کرتے، البتہ ہندوستان میں انہوں نے کہاں کہاں کا سفر کیا اس کا علم نہیں ہوتا لیکن ان کی بعض تحریروں کے اشارات سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے چند جگہوں کا سفر کیا ہوگا، ان کے قیام عظیم آباد کے بعد کے سترہ اٹھارہ سال جو پٹنہ میں گذرے شاید اسی دوران یہ اسفار ہوئے ہوں گے، گرچہ کہیں صراحۃً انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن کتابوں کے ضمن میں کتب خانوں کا جہاں ذکر کیا ہے، مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

> "پنجاب کے شہر بھاول پور میں جناب مولوی شمس الدین مرحوم کا نامی کتب خانہ ہے انہیں کے کتب خانہ میں معجم کبیر بخط ولایت موجود ہے"۔

ایک موقع سے لکھتے ہیں:

> "ہندوستان میں ایک نہیں مسند حمیدی کے تین نسخے ہیں، ایک نسخہ مکرمی جناب مولانا مولوی محمد سعید صاحب مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد کے کتب خانہ میں، دوسرا نسخہ میرے مکرم دوست جناب مولوی شیخ احمد مکی جن کا اکثر قیام بھوپال میں رہتا ہے، ان کے پاس ہے، مگر یہ نسخہ پورا نہیں، ناقص ہے، تیسرا نسخہ شفیقی مولوی عبدالحق صاحب ساکن کرنول ضلع مدراس کے پاس ہے، میں نے وہ حدیث اسی کرنول کے نسخے سے نقل کی ہے، اس میں بعینہ وہ روایت موجود ہے"۔

ایک جگہ لکھتے ہیں:

”مسند ابن راہویہ کا پتہ اگر آپ کو نہیں ملتا تو مجھ سے سنیے کہ قاہرہ کے کتب خانہ میں یہ کتاب موجود ہے“۔[81]

کیا یہ ساری کتابیں ان تک یونہی پہنچی تھیں یا انہوں نے اسفار بھی کیے تھے اس کا صحیح علم نہیں، کاش کہ ان کے کسی شاگرد نے ان کی سوانح حیات لکھی ہوتی تو ان باتوں کا علم ہوتا۔

بہ ظاہر معاصرین سے اتنے وسیع تعلقات اور ان کتب خانوں سے واقفیت اسفار کے بغیر صرف مراسلت سے ناممکن ہے۔

آثارُ السنن

اخیر میں حضرت نیموی کے اس علمی کارنامے پر تفصیلی روشنی ڈالی جاتی ہے جس نے ان کو شہرت عام کے خلعت دوام سے سرفراز کیا ہے۔

عالم اسلام کے مشہور حنفی عالم و محقق علامہ زاہد الکوثری لکھتے ہیں:

وها هو العلامة مولانا ظهير حسن النيموي رحمه الله قد ألف كتابه (آثار السنن) في جزأين لطيفين ()، وجمع فيهما الأحاديث المتعلقة بالطهارة والصلاة على اختلاف مذاهب الفقهاء، وتكلم على كل حديث منها جرحًا وتعديلاً على طريقة المحدثين، وأجاد فيما عمل كل الإجادة، وكان يريد أن يجري على طريقته هذه إلى آخر أبواب الفقه لكن المنيّة حالت دون أمنيته رحمه الله. وهذا الكتاب مطبوع بالهند طبعًا حجريًا إلا أن أهل العلم تخاطفوه بعد طبعه، فمن الصعب الظفر بنسخة منه إلا إذا أعيد طبعه۔

مشہور محقق و محدث علامہ ابو محفوظ الکریم معصومی کے بقول:

”علامہ نیموی کی مشہور تصنیف آثار السنن اپنے خصائص و مزایا کے لحاظ سے شاہکار سمجھی جاتی ہے، علامہ نیموی کے پاس قلمی نوادر کا گراں بہا ذخیرہ تھا، جو ۱۹۴۶ء کے طوفان حوادث میں بالکل برباد ہو گیا، اور اب صرف اس کی یاد باقی ہے، انہوں نے مخطوطات کے تجسس میں کہاں کہاں کی خاک چھانی، اس کا اندازہ ان نسخ عتیقہ کے حوالجات سے معلوم ہو سکتا ہے جو آثار السنن کی تعلیق اور ان کے بہتیرے فروعی رسائل میں بکثرت نظر آتے ہیں، حدیث میں نیموی کا درجہ اتنا بلند تھا کہ حسب بیان مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی عمید مدرسۂ عالیہ کلکتہ محدث نبیل علامہ جلیل حضرت شاہ انور کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

نیموی کو شوکانی پر ترجیح دیتے تھے“۔

اس کے علاوہ اس سلسلہ میں ماہرین کے اعترافات ان کے فضل وکمال کے اعتراف میں گذر چکے ہیں۔

آثار السنن کے لئے انہوں نے پوری تیاری کی، قلمی نسخے منگوائے، اور لوگوں سے مراسلت کی، اور کئی سال کی محنت کے بعد یہ اس کی پہلی جلد تیار کی، مولانا ڈاکٹر عتیق الرحمٰن نے علامہ شوق نیموی حیات و خدمات میں آثار السنن اور اس کی خصوصیات پر پورا باب قائم کیا ہے، اور بتایا ہے کہ حضرت مصنف نے اس کے لئے کیا محنتیں کیں اور اس کی کیا کیا خصوصیات ہیں۔

آثار السنن کی طباعت کے متعلق مولانا مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی نے تفصیل سے اطلاع فراہم کی ہے، اور تلاش وتحقیق کے بعد تمام طباعتوں اور ایڈیشنوں کا جائزہ لیا ہے۔ چنانچہ ان کے مطابق آثار السنن کی پہلی جلد کی اشاعت ۱۳۲۱ھ میں احسن المطابع پٹنہ ہی سے ہوئی، مولوی عبدالقادر مالک مطبع نے مصنف کی نگرانی میں عابد حسین سے کتابت کرواکر شائع کیا۔ آثار السنن سے متعلق اور بہت سے مباحث ہیں، اس کی شرح وتوضیح اور طباعتوں کی تفصیل مستقل ایک مفصل مضمون کی متقاضی ہے، ان شاء اللہ اس پر کبھی مستقل مضمون میں روشنی ڈالی جائے گی۔

حوالہ جات

۷۲. حیات نعمانی از مولانا عتیق الرحمن سنبھلی، لکھنؤ، تذکرہ علامہ انور شاہ کشمیری۔

۷۳. عمدۃ العناقید مشمولہ القول الحسن ص ۱۵۴

۷۴. عمدۃ العناقید مشمولہ القول الحسن ص ۱۵۵

۷۵. ورق الف ۵

۷۶. حوالہ سابق

۷۷. القول الحسن میں اس کو حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن کی طرف منسوب کیا گیا ہے، ویسے عام طور پر یہ رائے علامہ انور شاہ کشمیری کی طرف منسوب ہے، اور مختلف تحریروں میں ان کے کئی شاگردوں نے ان کے حوالہ سے نقل کیا ہے، جس میں مولانا منظور نعمانی قابل ذکر ہیں، اور مولانا سعید اکبر آبادی کے حوالہ سے شوکانی پر ان کو ترجیح دینے کا ذکر آگے آرہا ہے۔

۷۸. حوالہ سابق

۷۹. ورق ۷

۸۰. فکر وفن پروفیسر حبیب الحق ندوی ص ۱۵۳

۸۱. یہ تحریریں ان کے رسائل میں جابجا موجود ہیں، یہاں اصل بحث ان کے اسفار سے ہے اس لئے ان کے حوالے نہیں دیئے گئے۔

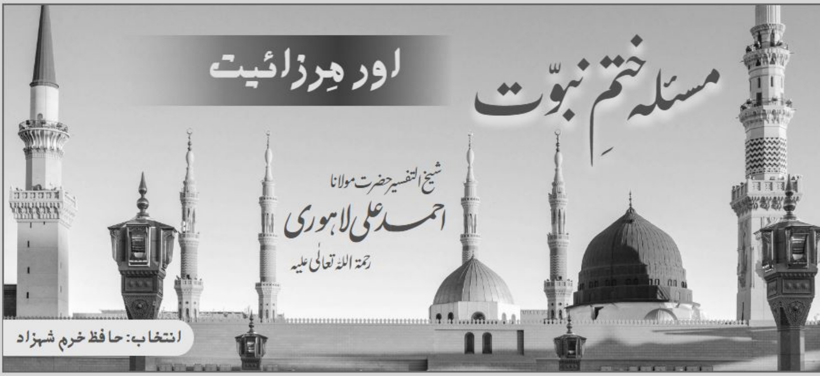

”مسئلہ ختم نبوت مسلمانوں اور مرزائیوں کے درمیان اس وقت سے مابہ النزاع چلا آرہا ہے جب سے مرزا غلام احمد نے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا ہے۔ مرزا بھی اپنی نبوت کو ثابت کرنے کے لیے ختم نبوت کی تاویل آخر دم تک کرتے رہے تاکہ ان کی نبوت فیل نہ ہو جائے اور اسی دن سے حق پرست علماء کرام بھی دلائل قطعیہ سے مرزا کی قصر نبوت کی بنیادیں کھوکھلی کرتے رہے چنانچہ وہ جلیل القدر علماء کرام بھی پہنچے ان علماء کرام میں سے مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا مرتضیٰ حسن چاندپوریؒ (مدرس دارالعلوم دیوبند) اور پنجاب میں مولانا ثناءاللہ صاحب امرتسریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ایسے ہی حضرات علماء کرام کی سعی جمیلہ کا نتیجہ ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں نے مرزائیت کے خلاف جہاد کو اپنے لیے صد صرف اور صد فخر سمجھا مگر اب پھر شجرۂ مرزائیت کی مرجھائی ہوئی شاخیں تر و تازہ ہو رہی ہیں۔ مرزائی جماعت کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس طرح مرزا کی ختم نبوت کے متعلق غلط تاویل کو سامنے رکھ کر مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں اور مرزا کی تحریک کو زندہ رکھنے کے لیے ان کے خلف الرشید بننا چاہتے ہیں اسی طرح حق پرست علماء کرام اگرچہ دنیا سے رخصت ہو کر اپنے مزارات میں جنت کی ہوا کھا رہے ہیں مگر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ان حضرات کی مسند پر بھی رونق افروز ہونے والے خلف الرشید حضرت مولانا لال حسین صاحب اختر (رحمتہ اللہ علیہ) اور دوسرے علماء کرام موجود ہیں جو میدان مبارزت میں مرزائیوں کو پکار کر میدان میں لانے والے ہیں۔

مرزائیوں کے موقر اخبار ”الفضل“ ۳ذی قعدہ ۱۳۷۱ھ (بمطابق) ۲۶ جولائی ۱۹۵۲ء کے صفحہ نمبر ۴ پر مولوی ابوالعطاء صاحب فاضل پرنسپل جامع احمدیہ نے مجھے چیلنج دیا ہے اور میرے نزدیک اس بارے میں مولوی صاحب کو چیلنج دیا جا سکتا ہے، مگر وہ چودھویں صدی سے پہلے کے کسی کا مستند قول پیش کریں جس نے کہا ہو کہ خاتم کے معنی مہر کرنا غلط ہے۔

پہلا جواب:

غالباً مولوی صاحب موصوف نے فن مناظرہ کی کتاب ''رشیدیہ'' جو داخل درس نصاب ہے، وہ نہیں پڑھی ہوگی تو ورنہ اس قسم کا سوال مجھ سے ہرگز نہ کرتے۔ فن مناظرہ کا یہ قاعدہ ہے کہ مثبت (مدعی کو ثابت کرنے والے) کو ثبوت دینا ضروری ہے نہ کہ نافی (نفی کرنے والے) کو، مولوی صاحب کو یہ ثبوت دینا چاہیے تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا فلاں فلاں مفسرین حضرات نے خاتم النبیین کے یہی معنی کیے ہیں جو مرزا کرتے ہیں کہ آئندہ نبوت کا دروازہ کھل گیا ہے تاکہ آپ نبیوں کے شہنشاہ بن جائیں۔

دوسرا جواب: (مسلمانوں کی تائید میں آٹھ مفسرین)

اس سے پہلے میں ثابت کر چکا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں خاتم النبیین کے معنی یہ ہیں کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔

آپ اب آٹھ مقتدر مفسرین حضرات کے حوالے ملاحظہ فرمائیے کہ وہ بھی ہماری تائید فرما رہے ہیں:

(۱) الجواہر فی تفسیر القرآن: وخاتم النبیین فھو آخرھم الذی ختم (جلد۱۶، ص۲۶)۔ ''پس وہ آخری پیغمبر ہے جس نے سب پیغمبروں کو ختم کر دیا یعنی سلسلہ نبوت کو نئے نبی کے لیے ختم کر دیا۔''

(۲) بیضاوی شریف: واخر الذي ختمهم۔ ''اور آپ سب سے آخری پیغمبر ہیں، آپ نے سب پیغمبروں کو ختم کر دیا۔''

(۳) روح البیان جلد رابع، ص:۸۷، وکان آخرھم الذي ختموا بہ۔ ''اور آپ ان پیغمبروں میں سے سب سے آخری پیغمبر ہیں جس کے آنے سے پیغمبروں کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔''

(۴) تفسیر خازن: وخاتم النبیین ختم اللہ بہ النبوۃ فلا نبوۃ بعدہ ای ولا معہ۔ ''اللہ نے آپ کے تشریف لانے سے نبوت کو ختم کر دیا، اس لیے آپ کے بعد کوئی نبی نہ ہوگا اور نہ آپ کے وقت میں کوئی نہیں ہو سکتا ہے۔''

(۵) تفسیر ابن جریر جلد نمبر ۲۱: وخاتم النبیین الذین ختم النبوۃ فطبع علیھم ولا تفتح لاحد بعدہ الی قیام الساعۃ۔ ''آپ کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے نبوت کو ختم کر دیا ہے پس نبوت پر مہر لگا دی گئی، اس لیے نبوت کا دروازہ آپ کے بعد قیامت تک کسی پر کھولا نہیں جائے گا۔''

(۶) روح المعانی جلد ۲۲: والمراد بکونہ الصلوۃ والسلام خاتمھم انقطاع حدوث وصف النبوۃ فی احد من الثقلین بعد تحلیہ علیہ الصلوۃ والسلام بھا فی ھذہ النشاۃ۔ ''آپ کے خاتم النبیین ہونے کی مراد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نبوت کے زیور سے اس زمانہ میں آراستہ ہونے کے بعد جنوں اور انسانوں میں سے کوئی بھی نبوت کی

صفت سے موصوف نہیں ہوگا۔"

(۷) تفسیر مدارک: وخاتم النبیین بمعنی الطابع ای اخرهم۔ "خاتم النبیین مہر لگانے والا، سب پیغمبروں کے آخر میں آنے والا یعنی آپ کے بعد کوئی نبی نہیں بنایا جائے گا اور عیسیٰ علیہ السلام ان لوگوں میں سے ہیں جو آپ سے پہلے نبی بنائے گئے ہیں۔"

(۸) تفسیر ابن کثیر: وخاتم النبیین فهذه الآیة نص فی انه لا نبی بعده، واذا کان لا نبی بعده ولا رسول بعده بالطریق الاولیٰ والاخریٰ لان مقام الرسالة ارفع من مقام النبوة۔ "پس یہ آیت صاف طور پر بتلا رہی ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا اور جب نبی آپ کے بعد نہیں آئے گا تو رسول بھی بطریق اولیٰ نہیں آئے گا کیونکہ رسول کا درجہ نبی کے درجہ سے بلند ہوتا ہے۔"

نتیجہ: آٹھ مقتدر مفسرین حضرات کا متفقہ فیصلہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا۔ اگر مرزائی مسلمانوں کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہم بھی تمھاری طرح ختم نبوت کے قائل ہیں تو پھر کیوں نہیں صاف طور پر اقرار کرتے کہ مرزا کے اخبار البدر کے دعویٰ کو ہم جھوٹا سمجھتے ہیں اور مرزا بشیر الدین محمود کے اس اعلان کو بھی جھوٹا سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے مسیح موعود کا نام بھی نہیں سنا وہ بھی کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ جب باپ اور بیٹے کے ان اعلانوں کا انکار نہیں کرتے تو پھر کیوں مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں کہ ہم بھی ختم نبوت کے قائل ہیں اور بازاروں اور دکانوں پر مفت اشتہار اور اخبار کے پرچے تقسیم کرتے پھرتے ہیں۔"

(تفسیر لاہوری، جلد ۷، ص: ۴۷۷ تا ۴۷۹)

قبل از اسلام بیوہ عورت محرومی کا شکار تھی اسے کوئی عزت حاصل نہ تھی وہ اپنے شوہر کی وفات کے بعد بقیہ زندگی نہایت تکلیف و مصیبت میں بسر کرتی۔ یہودیوں کے یہاں بیوہ عورت اپنے شوہر کے بھائی کی ملکیت ہو جاتی تھی، وہ جس طرح چاہتا اسے رکھتا اور جو چاہتا اس کے ساتھ سلوک کرتا۔ کوئی اس کی داد رسی نہیں کر سکتا تھا۔

عیسائی مذہب نے بھی بیوہ عورت کے لیے کوئی مثبت ہدایت نہیں دیں۔ ہندو مذہب میں تو شوہر کی وفات کے بعد بیوہ کو جینے کا حق ہی نہیں تھا اور وہ شوہر کی چتا میں زندہ جل کر ستی کی رسم پورا کرنا اپنا مذہبی فرض سمجھتی تھی وہ اگر زندہ بھی رہتی تو پوری زندگی اپنے شوہر کے سوگ میں گزارتی۔ اسے زیب و زینت یا دنیا کی لذتوں سے لطف اندوز ہونے کا کوئی حق نہ تھا۔ عربوں میں بھی بیوہ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد بیوہ شوہر کے وارثوں کی ملکیت میں آجاتی اور وہ جیسا سلوک چاہتے اس کے ساتھ کرتے۔ اس سے مہر معاف کراتے۔ طرح طرح سے ستاتے۔ اسے اپنی مرضی سے دوسری شادی نہیں کرنے دیتے۔

نبی آخر الزمان حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو بیوہ کے برے دن اچھے دنوں میں بدل گئے۔ آپ علیہ السلام نے نہ صرف بیوہ عورت کو معاشرے میں باعزت مقام دلایا۔ اس کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید کی بلکہ اپنے عمل سے بیوہ کو وہ شان و عظمت عطا کی جس کا تصور بھی عربوں میں نہیں کیا جا سکتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پچیس سال کی عمر میں بیوہ سے نکاح کیا۔ خوبصورت سے خوبصورت عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نکاح کو قبول کر سکتی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چالیس سالہ ادھیڑ عمر کی بیوہ سے شادی کر کے جاہلانہ رسموں کے خلاف عملی قدم اٹھایا حالانکہ اس عمر میں ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ کم سن عورت سے شادی کرے۔

اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پچیس سال تک اِس طرح ان کے ساتھ شریکِ حیات رہے کہ اِس دوران آپ نے کوئی دوسرا نکاح نہیں فرمایا۔ اور حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دس عورتوں:

حضرت عائشہ بنت ابی بکر، حضرت سودہ بنت زمعہ، حضرت حفصہ بنت عمر، حضرت زینب بنت خزیمہ، حضرت ام سلمہ بنت ابی امیہ، حضرت زینب بنت جحش، حضرت جویریہ بنت الحارث، حضرت ام حبیبہ بنت ابی سفیان، حضرت صفیہ بنت حیی، اور حضرت میمونہ بنت حارث رضی اللہ عنہم سے نکاح کیا وہ بھی سوائے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساری بیوہ ہی تھیں۔ اسی طرح متعدّد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنے زمانے کی مختلف بیوہ عورتوں کی فریادرسی کی اور ان کے شریک حیات بن کر خود ان کو سہارا دیا۔ چناں چہ حضرت اسما بنت عمیس رضی اللہ عنہا کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے شوہر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ جب غزوہ موتہ میں شہید ہو گئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کی۔ اسی طرح حضرت عاتکہ رضی اللہ عنہ کے شوہر حضرت عبد اللہ بن ابی بکر رضی اللہ عنہ جب شہید ہوئے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے شادی کی۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے جاں نثار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی زیر کفالت تمام بیوہ عورتوں کے نان نفقہ کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھایا اور سوسائٹی و معاشرے میں دوبارہ ان کو عزت و آبرو کے ساتھ داخلے کا موقع دیا اور ان کو سماج و معاشرہ میں اس مہر و عنایت سے مشرف فرمایا جس کے سائے سے وہ محروم ہو گئی تھیں۔

کسی عورت کے لیے اس سے زیادہ آزمائش اور مصیبت کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کا شوہر اس سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو جائے۔ شوہر کی وفات سے بیوی کو صرف جذباتی صدمہ ہی نہیں پہنچتا بلکہ اس کے سامنے مسائل کا ایک ہجوم منڈلانے لگتا ہے۔ کل تک جو شخص اس کی اور اس کے بچوں کی تمام ضروریات پوری کرتا تھا، اس کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا، ہر آڑے وقت میں اس کا سہارا بنتا تھا، اس کی عزت و عفت کی حفاظت کرتا تھا، جس کے دیکھتے ہی اس کا دل خوشیوں سے بھر جاتا تھا، جو گھر کی رونق تھا، جو تمام اخراجات اور حادثات کے وقت اس کا تنہا سہارا تھا، اس کے انتقال سے عورت پر جو گزرتی ہے اس کا اندازہ صرف بیوہ ہی لگا سکتی ہے۔

اس مظلوم اور مصیبت زدہ عورت کے ساتھ ہمیشہ حسنِ سلوک کیجیے۔ ایک یتیم بچہ جس طرح اپنے باپ کی وفات سے بے سہارا ہو جاتا ہے، اسی طرح بیوہ اپنے شوہر کی وفات سے بے سہارا ہو جاتی ہے۔ دونوں کی مصیبتوں اور پریشانیوں میں یکسانیت ہے۔ چنانچہ اسلام نے یتیم کی کفالت کرنے پر جس طرح جنت کی خوشخبری سنائی اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیم کی کفالت کرنے والے کے بارے میں فرمایا کہ میں اور وہ ان دونوں انگلیوں کی طرح جنت میں ہوں گے۔ اسی طرح بیوہ عورت کے مسائل حل کرنے والے کے سلسلے میں بھی ارشاد فرمایا کہ وہ اور میں جنت میں دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا: بیوہ اور غریب کی خاطر دوڑ دھوپ کرنے والا اس شخص کی طرح ہے جو راہِ خدا میں جہاد کرتا ہے اور اس شخص کی طرح ہے جو دن کو روزہ رکھتا اور رات کو نماز پڑھتا ہے۔ (بخاری، مسلم، موطاء امام مالک)

بیوہ کے حقوق

بیوہ کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کے شوہر کے ترکہ میں سے اسے مقررہ حق دلایا جائے۔ اگر شوہر نے اولاد چھوڑی ہو تو بیوہ کو ترکہ کا آٹھواں حصہ دلایا جائے اور اگر اولاد نہ چھوڑی ہو تو کل ترکہ کا چوتھائی حصہ دلایا جائے۔ ترکہ کو اسلامی تعلیمات کے مطابق تقسیم کیا جائے ورنہ تمام مال حرام ہو جاتا ہے۔ لڑکی، بیوی، ماں، بہن سب کے حصے پورے پورے دیے جائیں۔ اگر شوہر نے مرنے سے پہلے مہر ادا نہیں کیا ہے تو سب سے پہلے ترکہ میں سے بیوہ کو اس کا مہر دلایا جائے۔ اسی طرح اگر شوہر اپنی بیوی کے لیے کوئی وصیت کر گیا ہے تو ترکہ کے ایک تہائی مال تک اس کی وصیت کو پورا کیا جائے۔

بیوہ کا دوسرا حق یہ ہے کہ اس کی کفالت کا فوراً نظم کیا جائے۔ اگر اسلامی حکومت ہے تو اس کے اخراجات اور کفالت کی ذمہ دار ہے۔ اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہو تو مسلم معاشرہ اس کے ساتھ حد درجہ ہمدردی کرے۔ اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔ جب تک وہ دوسرا نکاح نہیں کر لیتی۔ اس وقت تک مسلم معاشرہ بہتر انداز سے اس کی کفالت کرے۔

حضرت زید بن اسلمؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عمر بن خطابؓ کے ساتھ بازار کی طرف گیا۔ وہاں ایک عورت ملی اور حضرت عمرؓ سے مخاطب ہو کر بولی: اے امیر المومنین میرے شوہر کا انتقال ہو گیا ہے، وہ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ گیا ہے۔ خدا کی قسم ان کے پاس بکری کا ایک پایہ بھی نہیں ہے، جسے وہ پکا سکیں۔ نہ ان کے پاس کھیتی ہے نہ دودھ دینے والا جانور۔ میں ڈرتی ہوں کہ کہیں قحط انہیں ہلاک نہ کر دے۔ میں خفاف بن ایما کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ حدیبیہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا۔ حضرت عمرؓ ان کے پاس ٹھہر گئے اور آگے نہ بڑھے اور فرمایا: تیرا نسب تو میرے نسب سے ملتا جلتا ہے۔ پھر آپ ایک طاقتور اونٹ کی طرف آئے جو گھر میں بندھا ہوا تھا اس پر دو بوریاں رکھیں اور انہیں اناج سے بھر دیا۔ ان کے درمیان نقدی اور کپڑے رکھ دیے پھر اس کی رسی عورت کے ہاتھ میں دے دی اور فرمایا: اسے لے جاؤ! یہ ختم ہونے سے پہلے اللہ تمہیں اس سے بہتر عطا کر دے گا۔ ایک آدمی نے (یہ دیکھ کر) کہا کہ اے امیر المومنین! آپ نے اس عورت کو بہت دے دیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: تیری ماں تجھے کھوئے خدا کی قسم! میں نے اس کے باپ اور بھائی کو دیکھا کہ انہوں نے ایک مدت تک ایک قلعہ کا محاصرہ کیے رکھا یہاں تک کہ اسے فتح کر لیا۔ (بخاری)

بیوہ کا تیسرا حق یہ ہے کہ عدت پوری ہو جانے کے بعد اسے سوگ اور ماتم سے نجات دلائی جائے۔ اس کے رنج وغم کو بھلانے کے لیے بہتر سے بہتر طور طریقے اختیار کئے جائیں۔ جائز حدود میں اسے زیب و زینت اور آرائش و سنگھار کرنے کا حق دیا جائے۔

بیوہ کا چوتھا حق یہ ہے کہ عدت پوری ہو جانے کے بعد اس کے نکاحِ ثانی کا انتظام کیا جائے۔ آج کل ہمارے معاشرہ میں بیوہ سے نکاح کرنے کو معیوب سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ بھی ایک اہم سنت ہے جس کی طرف مسلمانوں کو فوری توجہ کرنی

چاہیے۔ دورِ اول میں اسلامی معاشرہ میں بیواؤں سے شادی کرنے کو بڑے اجر کا کام سمجھا جاتا تھا اور اس سے مسلم معاشرہ بہت سے مسائل سے دوچار ہونے سے بچ جاتا تھا۔ کسی بیوہ سے نکاح کر کے اس کی اور اس کے بچوں کی کفالت کرنا عظیم نیکی ہے جس کے حصول پر ہر مسلمان کو سعادت محسوس کرنا چاہیے۔ خود کسی بیوہ سے نکاح کر کے اس نیکی و سعادت کو حاصل کیجئے، یا اس کا نکاح کسی مناسب شخص سے کرا کر حکمِ خداوندی کی تعمیل کیجئے، یا اس سلسلے میں جو بھی خدمت انجام دے سکتے ہوں اسے ضرور انجام دیجئے۔ قرآن پاک میں حکم دیا گیا ہے: وانکحوا الایامٰی منکم (النور: 23) اپنی بیوہ عورتوں اور رنڈوے مردوں کے نکاح کر دو۔

بیوہ کا پانچواں حق یہ ہے کہ وہ اپنا نکاح کرنے کا پورا اختیار رکھتی ہے۔ اس کے میکے یا سسرال کے لوگ اسے نکاح کرنے یا نہ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ہاں اسے مشورہ ضرور دے سکتے ہیں۔ وہ اس سلسلے میں پوری طرح آزاد ہے کہ کس سے نکاح کرے اور کس سے نکاح نہ کرے۔ جن علماء کے نزدیک کنواری لڑکی کے لیے ولی کی اجازت ضروری ہے ان کے نزدیک بھی بیوہ کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں۔ بیوہ اسلامی تعلیمات کے مطابق اپنے نکاح کے سلسلے میں مکمل خود مختار ہے۔

اگر بیوہ عورت ننھے منے بچے رکھتی ہے اور وہ ان کی پرورش کی خاطر کوئی دوسرا نکاح نہیں کرتی اور یہ سمجھتی ہے کہ دوسرا نکاح کرنے سے ان بچوں کی پرورش متاثر ہوگی اور وہ ان بچوں کی پرورش کے لیے محنت کرتی ہے تو یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی بیوہ کی عظمت ایک واقعہ کی صورت میں یوں بیان فرمائی: قیامت کے دن میں سب سے پہلے جنت کا دروازہ کھولوں گا تو دیکھوں گا کہ ایک عورت مجھ سے پہلے جنت میں جانا چاہتی ہے۔ میں پوچھوں گا تو کون ہے؟ تو وہ کہے گی کہ میں ایک بیوہ عورت ہوں جس کے چند ننھے یتیم بچے تھے۔ (مسند ابویعلی بحوالہ سیرت النبی، سید سلیمان ندوی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا: میں اور وہ عورت جو اپنے بچوں کے لیے محنت و مشقت کی وجہ سے کالی پڑ جائے، جنت میں ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے، وہ حسن و جمال اور عزت و جاہ والی عورت جو شوہر کے مرنے کے بعد بیوہ ہو جائے لیکن اپنے ننھے منے یتیم بچوں کی خاطر اپنے کو روکے رکھے یہاں تک کہ وہ اس سے الگ ہو جائیں یا وفات پا جائیں۔ (ابوداود شریف)

قارئین کرام! ہمیں چاہیے کہ ہم ان حقوق کی پاسداری کریں، بیوہ اور یتیم بچوں کی دادرسی کو اپنا فریضہ سمجھیں، اللہ پاک امت مسلمہ کو قرآن و سنت کے احکامات پہ عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

پاکستان شریعت کونسل کا مشاورتی اجلاس

از مولانا حافظ امجد محمود معاویہ

پاکستان شریعت کونسل نے ایران پر اسرائیلی حملہ کو بدترین جارحیت قرار دیتے ہوئے ایران کے دفاعی اقدامات کی مکمل حمایت کی ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ ایران اپنے دیگر دوستوں کے تعاون سے اسرائیلی درندگی اور دہشتگردی کا راستہ روکنے میں کامیاب ہو گا۔

گزشتہ روز جامعہ اسلامیہ کامونکی میں کونسل کے سیکرٹری جنرل مولانا عبد الرؤف فاروقی کی دعوت پہ پاکستان شریعت کونسل کے سرکردہ راہنماؤں کا ایک مشاورتی اجلاس ہوا جس کی صدارت کونسل کے امیر مولانا زاہد الراشدی نے کی اور اس میں ڈاکٹر مولانا حافظ محمد سلیم، مولانا عبید اللہ عامر، ڈاکٹر مولانا عبد الواحد، پروفیسر حافظ منیر احمد، مولانا عثمان رمضان، مولانا امجد محمود معاویہ، مفتی نعمان احمد، مولانا نصر الدین خان عمر، مولانا نعمان یوسف، مظہر محمود، حافظ شاہد میر اور دیگر حضرات نے شرکت کی۔

اجلاس میں مشرق وسطیٰ کے معاملات میں امریکی صدر ڈونالڈ ٹرمپ کی مسلسل مداخلت کو عالمی امن تباہ کرنے کا منصوبہ قرار دیا گیا اور اقوام متحدہ سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ خالی قراردادوں کی بجائے اسرائیلی جارحیت اور امریکی پشت پناہی کا راستہ روکنے کے لیے عملی اقدامات کرے۔

اجلاس میں محرم الحرام کی آمد سے قبل فرقہ وارانہ کشیدگی کو فروغ دینے کی کوششوں کو قومی وحدت کے تقاضوں کے منافی قرار دیا اور طے کیا کہ چند سال پہلے قائم ہونے والے اہل سنت کے مختلف مکاتب فکر کے راہنماؤں کے مشترکہ فورم، کل جماعتی مجلسِ عمل علماء اہل سنت پاکستان کو از سرِ نو متحرک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس مقصد کیلئے مذکور مجلسِ عمل کے کنوینئر مولانا عبد الرؤف فاروقی کو مکمل حمایت کا یقین دلاتے ہوئے فیصلہ کیا گیا کہ پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی رابطہ کمیٹی مولانا ڈاکٹر حافظ محمد سلیم کی سربراہی میں سب مکاتب فکر کے سرکردہ علماء کرام سے ملاقات کرے گی اور محرم الحرام کے آغاز سے قبل لاہور میں ایک مشترکہ کنونشن منعقد کیا جائے گا۔

اجلاس میں حالیہ بجٹ کو حسب سابق عالمی مالیاتی اداروں کی منصوبہ بندی کا نتیجہ قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ اس میں عوام کو ریلیف دینے کی بجائے مراعات یافتہ طبقوں اور غیر ملکی مداخلت کاروں کیلیے سہولت کاری کا پورا سامان موجود ہے۔ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے کہا گیا کہ سودی نظام کے خاتمے، غیر ملکی مداخلت سے نجات،

طبقاتی مفادات وتعیش سے گلوخلاصی کے بغیر عوام کو سہولت فراہم کرنے کے کوئی صورت مؤثر نہیں سکتی، اس لیے ہمیں قومی خود مختاری کی بحالی اور دستور کے مطابق سودی نظام کے مکمل خاتمہ کے لیے از سرنو جدوجہد کو منظم کرنا ہوگا۔

اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا زاہد الراشدی نے بھارتی جارحیت کے جواب میں پاکستانی افواج کے کردار کو ملک و قوم کے لیے قابل فخر قرار دیا اور قومی اداروں کو خراج تحسین پیش کیا۔ جبکہ مولانا عبد الرؤف فاروقی نے اپنے خطاب میں دینی قوتوں میں باہمی مفاہمت اور اشتراکِ عمل کے فروغ کو وقت کا اہم تقاضہ قرار دیا اور کہا کہ پاکستان شریعت کونسل اس کے لیے مسلسل متحرک رہے گی۔

(۱۸ جون ۲۰۲۵ء)

الشریعہ اکادمی کا سالانہ نقشبندی اجتماع

مولانا محمد اسامہ قاسم

آج کے فتنہ خیز اور پُرآشوب دور میں ایمان کی حفاظت اور گناہوں سے بچنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی طوفان میں چراغ جلائے یا دہکتے انگارے کو ہاتھ میں تھامے۔ دل کی پاکیزگی اور روح کی صفائی کے لیے اہل اللہ کی صحبت اور مجالسِ ذکر میں شرکت از حد ضروری ہو چکی ہے۔ نیک لوگوں کی رفاقت انسان کو بھلائی کی طرف راغب کرتی ہے، جبکہ بُرے افراد کا ساتھ اُسے گمراہی کی طرف لے جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا اور دنیا و آخرت کی کامیابی اسی میں ہے کہ انسان اللہ کے مقرب بندوں کی قربت اختیار کرے، جن کی مجالس دلوں کو ایمان کی تازگی اور روحانیت عطا کرتی ہیں۔

مشائخ عظام کی خانقاہیں، علماء کرام کی اصلاحی مجالس اور اہل حق کی صحبتیں اس امت کے لیے روحانی تربیت گاہوں کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علماء کرام، جو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں، اپنے خطبات، دروس اور تزکیہ نفس کی کوششوں سے امت کی اصلاح اور معاشرتی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ بعثتِ نبوی ﷺ کا ایک عظیم مقصد بھی یہی تھا کہ انسانوں کو باطن کی پاکیزگی عطا کی جائے۔

اسی مقصد کو آگے بڑھاتے ہوئے، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ ہر سال حضرت علامہ زاہد الراشدی دامت برکاتہم کی زیر سرپرستی سالانہ نقشبندی اجتماع کا انعقاد کرتی ہے۔

اس سال کا روح پرور اجتماع بروز منگل، 17 جون 2025ء کو الشریعہ اکادمی، کوروٹانہ کیمپس گوجرانوالہ میں منعقد ہوا۔ مہمانِ خصوصی ہمیشہ کی طرح حضرت خواجہ خلیل احمد نقشبندی دامت برکاتہم تھے، جن کی موجودگی اہلِ دل کے لیے باعثِ فیض و برکت رہی۔ اس ایمان افروز اجتماع میں ملک کے نامور مشائخ و علماء کرام نے شرکت فرمائی، جن میں بالخصوص: حضرت خواجہ خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم، حضرت مولانا عبد الرحمن صاحب، حضرت مولانا شاہ نواز فاروقی صاحب، حضرت مولانا عبد الواحد رسولنگری صاحب، حضرت مولانا ہدایت اللہ جالندھری صاحب، حضرت مولانا مفتی فضل الہادی صاحب، پیر سمیع الحق صاحب شامل تھے۔

اجتماع کا آغاز تلاوتِ قرآن مجید سے ہوا، جو جامعہ نصرت العلوم کے صدر مدرس، استاد القراء مولانا قاری محمد سعید احمد صاحب نے نہایت خوش الحانی سے کی۔ بعد ازاں حافظ فیصل بلال حسان اور قاری ارشد محمود صفدر نے نعتِ رسول مقبول ﷺ پیش کی، جس سے محفل معطر ہو گئی۔

مولانا عبد الواحد رسولنگری صاحب نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ اسلام ایک کامل اور ابدی دین ہے۔ حق کو پہچاننا اور اس پر ایمان لانا ہر مسلمان کا فرض ہے، اسی طرح باطل اور فتنوں کو سمجھنا اور ان سے بچنا بھی نہایت ضروری ہے۔ آج کا دور فتنوں کا دور ہے، جہاں نظریاتی، فکری اور اخلاقی گمراہیاں ایمان کو چیلنج کر رہی ہیں۔ علماء کرام امت کو حق کا شعور دیتے اور فتنوں سے بچاؤ کا راستہ دکھاتے ہیں۔ دینی مدارس اور خانقاہیں دین کے وہ مضبوط قلعے ہیں جہاں سے صدائے حق بلند ہوتی ہے اور دلوں کو ایمان کی روشنی ملتی ہے۔

مولانا شاہ نواز فاروقی صاحب نے بعثتِ نبوی ﷺ کے دو اہم مقاصد بیان کیے: درس و تدریس (علمِ شریعت) تزکیہ نفس (روحانی

تربیت)

فقہی مذاہب میں سے فقہ حنفی کی خصوصیات اور تصوف کے چار سلاسل (نقشبندی، چشتی، قادری، سہروردی) کا تعارف پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے سلسلہ نقشبندیہ کو اختیار کیا ہے، جو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے نبی کریم ﷺ تک پہنچتا ہے۔

اسی طرح چار ائمہ میں سے حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی فقہ حنفی کو اختیار کیا کیونکہ اس کو بھی دیگر پر فوقیت حاصل ہے

اکیڈمی کے ناظم، مولانا مفتی محمد عثمان صاحب نے الشریعہ اکادمی کے مختلف تعلیمی شعبہ جات کا تعارف کرایا، جن میں شعبہ حفظ و ناظرہ، شعبہ بنات، شعبہ درس نظامی اور آن لائن تعلیمی پروگرام شامل ہیں۔ ان شعبہ جات میں بڑی تعداد میں طلبہ و طالبات دینی علوم حاصل کر رہے ہیں۔

مولانا عبد الرحمان صاحب نے شریعت کی مکمل پیروی کو دین کی روح قرار دیا اور فرمایا کہ زبان، کان، ہاتھ اور آنکھ سمیت تمام اعضاء کو شریعت کے دائرے میں رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔ نبی کریم ﷺ کی حدیث کے حوالے سے فرمایا: "جو شخص مجھے اپنی زبان اور شرمگاہ کی حفاظت کی ضمانت دے، میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔"

انہوں نے زور دیا کہ شریعت پر مکمل عمل اور نفس کی اصلاح ہی اصل دین داری اور کامیابی ہے۔

اختتام پر مولانا زاہد الراشدی صاحب نے تمام مہمانوں کی آمد کا شکریہ ادا کیا۔

نماز عصر کے بعد حضرت مولانا خواجہ خلیل احمد صاحب دامت برکاتہم نے ختم خواجگان اور اختتامی دعا کروائی، جس سے محفل میں روحانی سرور اور برکت کی فضا قائم ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس اجتماع کو امت مسلمہ کے لیے ذریعہ ہدایت، اصلاح اور ایمان کی تازگی بنائے۔ آمین۔

(۱۷ جون ۲۰۲۵ء)

We have consistently highlighted Britain's ongoing role in the transformation of Palestine into Israel in various writings. Concurrently, the United States is actively engaged in perpetuating this British influence. One such article, now revised and presented to readers after approximately two decades, offers insight into the future intentions of Israel, the U.S., and their allies concerning Jerusalem and Palestine.

Over the past three-quarters of a century, global imperialism's grip on world affairs has tightened considerably. Its agenda is being pursued with increasing audacity and disregard, while Muslim leadership appears to remain in a deep slumber. Our emotions and sentiments regarding this situation can only be expressed through a plea in our imagination to the revered Prophet (PBUH):

اے خاصہ خاصانِ رسلؐ وقتِ دعا ہے
امت پر تری آکے عجب وقت پڑا ہے

"Oh, chosen among messengers, it is a time for prayer; Your Ummah faces an extraordinary trial."

On March 5, 2003, Roznama Nawa-i-Waqt Lahore reported, citing an Israeli newspaper, that then-Israeli Defense Minister General Shaul Mofaz stated: "In a few days, we will occupy Iraq, and anyone who stands in our way will face the same fate as Iraq." General Mofaz also referenced the Ottoman Caliphate, stating that when Ottoman Caliph Sultan Abdul Hamid refused to grant them land in Palestine, they not only ended his rule but also abolished the Ottoman Caliphate entirely. He warned that anyone who resisted Israel now would face a similar outcome.

This statement from the Israeli Defense Minister unequivocally clarified that the U.S. invasion of Iraq was, in fact, a plan to fulfill Zionist ambitions. It was

part of a global program that has been continuously underway for the past century, aiming to seize control of Islamic world resources and expand and secure Israeli borders. The U.S., Britain, and their allies have been persistently active in this endeavor.

Historical Context: Sultan Abdul Hamid II and Zionist Ambitions

Approximately one and a half centuries ago, Sultan Abdul Hamid II reigned as the Caliph of the Ottoman Empire, as mentioned by General Mofaz in his statement. The capital of the Ottoman Caliphate was Istanbul (Constantinople), and most Arab regions, including Palestine, Jordan, Iraq, Syria, Egypt, and Hejaz, had long been under Ottoman rule. Palestine was an Ottoman province, and the city of Jerusalem was considered one of the Ottoman Empire's important cities. At a global level, Jews had formulated a plan to settle in Palestine, establish an Israeli state, occupy Jerusalem, and construct the Third Temple in place of Al-Aqsa Mosque. They were actively working to pave the way for this through various means.

In his memoirs, the late Sultan Abdul Hamid wrote that a delegation from a global Jewish organization visited him, requesting permission to settle in Palestine. Ottoman law permitted Jews to visit Palestine and Jerusalem but prohibited them from purchasing land or settling there. Consequently, by the beginning of the 20th century, there were no Jewish settlements in all of Palestine. Jews were dispersed across various countries worldwide, lacking a state or a permanent city in any single location. The late Sultan Abdul Hamid refused this request because he was aware of the global Jewish plan concerning Israel, Jerusalem, and Palestine. Therefore, it was impossible for him to grant permission for Jews to settle in Palestine under these circumstances.

The late Sultan recounts that a second delegation of Jewish leaders met with him, offering to build a large university for the Ottoman Empire. This university would gather Jewish scientists from around the world, and these scientists would assist the Ottoman Caliphate in advancing science and technology, provided they were given land and suitable facilities. The late Sultan Abdul Hamid replied to the delegation that he was willing to provide land and all possible facilities for the university, on the condition that it be established in an area other than Palestine. He would not permit Jews to settle in Palestine under the guise of a university. However, the delegation did not accept this.

The late Sultan Abdul Hamid further wrote that a third delegation of Jewish leaders met him again, offering any amount of money he desired, if he would only permit a limited number of Jews to settle in Palestine. The late Sultan expressed

strong indignation at this and immediately instructed the delegation to leave the meeting room. He also told his staff not to schedule another meeting for this delegation in the future.

The Downfall of the Ottoman Caliphate and Zionist Involvement

Subsequently, a political movement against the Ottoman Caliph, Sultan Abdul Hamid, was fostered in Turkey. His government was overthrown by inciting the public with various accusations. After his government's demise, he spent the remainder of his life under arrest, during which he wrote the aforementioned memoirs. He noted that among the delegation that brought him the dismissal order from the Caliphate was Emmanuel Carasso, a Jewish member of the Turkish Parliament, who had also been part of the aforementioned Jewish delegation. This indicated that the political movement against the late Sultan and his dismissal was a consequence of Jewish conspiracies, a fact now confirmed by Israeli Defense Minister General Mofaz's statement almost a century later.

The late Sultan Abdul Hamid was a dignified and well-informed ruler who defended the Caliphate to the best of his ability and made every effort to thwart Jewish conspiracies. However, the Ottoman Caliphs who succeeded him proved to be puppet rulers. Under their guise, Western nations and Jewish organizations completed their agenda of ending the Ottoman Caliphate, which ultimately concluded in 1924.

The Turks disassociated themselves from the Arab world and established a secular government based on Turkish nationalism.

While Hussein Sharif of Mecca, the grandfather of Jordanian King Abdullah, launched an armed rebellion against the Ottoman Caliphate, declaring the independence of the Arab region. He was misled into believing that his caliphate would be established in the Islamic world after the Ottoman Caliphate's demise. However, his dream of an Arab caliphate was sabotaged by making one of his sons king of Iraq and another king of Jordan, with Jordan being granted the title "The Hashemite Kingdom of Jordan".

Meanwhile, the way was paved for the Al Saud family to seize control of the holy Hejaz, and Sharif Hussein of Mecca was placed under arrest, where he spent the rest of his life.

British Occupation and the Inflow of Jewish Settlers

During this period, Britain occupied Palestine and installed its governor, who permitted Jews to purchase land and settle in Palestine. Consequently, Jews began to settle in Palestine from various countries through an organized program. They

would purchase land in Palestine, often paying double or even quadruple the price. Many Palestinians, tempted by this greed, sold their lands, and despite warnings from religious scholars, allowed Jews to settle in Palestine purely for the lure of inflated prices.

At that time, the Grand Mufti of Palestine, Al-Haj Sayyid Amin al-Husseini, and leading Islamic scholars supporting him issued a fatwa stating that, since Jews intended to establish an Israeli state by settling in Palestine and their primary goal was to seize Jerusalem, it was religiously impermissible to sell land in Palestine to Jews. This fatwa was also issued by other prominent scholars, including Hakeem-ul-Ummat Hazrat Maulana Ashraf Ali Thanvi, as documented in his book "Bawadir al-Nawadir". Similarly, Grand Mufti Hazrat Maulana Mufti Kifayatullah Dehlvi also endorsed it, which is found in "Kifayat al-Mufti".

However, Palestinians paid no heed, and Jews arriving from various parts of the world succeeded in purchasing many lands and establishing their settlements in Palestine. Ultimately, in 1947, the United Nations recognized the Jews' right to a portion of Palestine, legitimizing their claim to statehood and approving the establishment of two separate states, Israel and Palestine, after which the British Governor transferred authority to the Jewish government.

This provides a brief background to the statement made two decades ago by Israeli Defense Minister General Mofaz, concerning the Jewish role in the dethronement of the late Sultan Abdul Hamid, ruler of the Ottoman Caliphate, and the Caliphate's demise. From this, one can gauge the vigilance, awareness, and preparedness of the enemies of the Islamic world, and conversely, the extent of our apathy, ignorance, and shortsightedness. May Allah Almighty have mercy on our condition, Ameen.